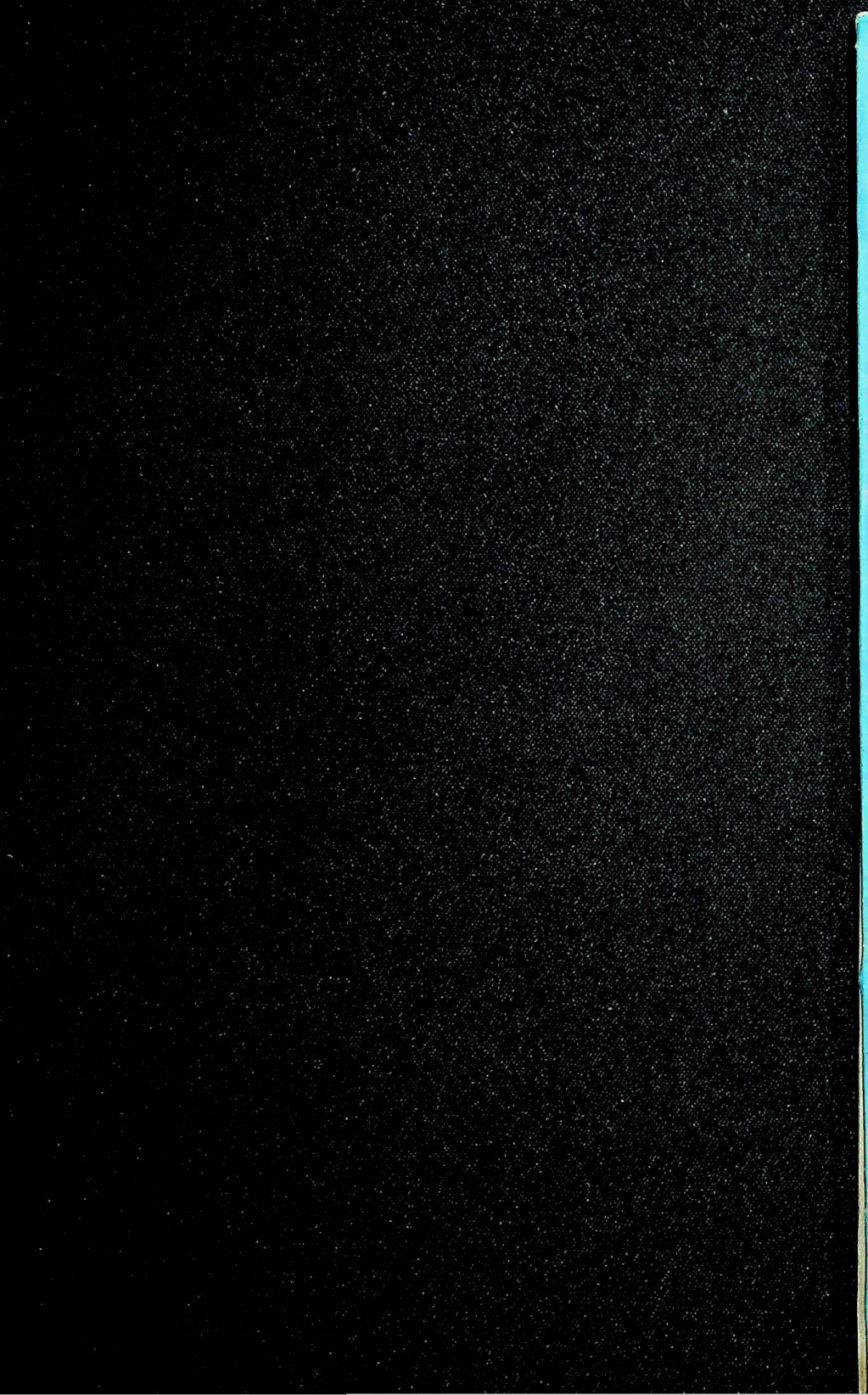






19

برادر م. بشیر شاہ کی خدمت میں

بہ یہ خطوط

عالم مناور
۱۱ ستمبر ۱۸۷۵ء

برجستہ

برجست

عابد مناورى

جے کے بکٹ ہاؤس ویر مارگ جموں (توی)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

غزل	: صنف	شاعری	: فن
ڈی۔ ڈی۔ کھولہ	: انتخاب	عابد مناوری	: فن کا
فضیلت	: تزئین	ماجد خاں رامپوری	: کتابت
۱۹۸۴ء	: اشاعت	ایک ہزار	: پہلی بار
۳۵ روپے	: قیمت	امرتیہ آنسٹ پریس	: مطبع

ناشر

جے کے بک ہاؤس، ویر مارگ جموں (توی)

اظہار تشکر

اس شعری مجموعہ کی اشاعت کے سلسلے میں جموں و کشمیر کی کلچرل اکیڈمی کی طرف سے جزوی مالی مدد کے لئے مصنف ممنون ہے۔

استاذی پدم نثری ابوالفصاحہ حضرت جوش ملیحانی مرحوم کے نام

یہ خبر کس قدر ہے بارِ گوش
آج ہم میں نہیں جنابِ جوش
وہ جو فردوسِ گوش تھی کل تک
آج عنقا ہے وہ نوائے مروش
بزمِ مے خانہ سخن ہے اُداس
اب نہ چھلکے گا "بارہ سر جوش"
ہائے وہ باشعور دیوانہ
ہائے وہ خالقِ "جنون و ہوش"

کس سے کسبِ ضیائے شعر کریں
ہو گئی شمعِ علم و فن خاموش

جموں - ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء

حکیم منظور کی نذر

میرے آنکھن میں بھی اے قوسِ قزح! اک دن اُتر
زندگی میں تیرا اک اک رنگ بھسنا ہے مجھے

۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۲ء تک

ایک ہی لفظ میں دستِ لکھنا
خط اُسے سوتھ سمجھ کر لکھنا

جب چلی تیسرہ ہوا کی تلوار
کتنے پیچھی ہوئے بے پر لکھنا

چاندنی کس کا مُقتدر ٹھہری
قوس کا تاریک رہا گھر لکھنا

نام بھی اُس کا جو لکھنا پڑ جائے
روشِ عام سے ہٹ کر لکھنا

جھیل سے اُبھری تھی جب قوس قزح
وہ سلگتا ہوا منظر لکھنا

خوف کرنا نہ ہوا کا ہرگز
ریگِ صحرایہ سمندر لکھنا

ہے عجب کربِ قلم اے عابد!
جو نہ لکھنا ہو وہ اکثر لکھنا

کیوں نہ اپنی خوبی قسمت پہ اتراتی ہوا
چاند جیسے اک بدن کو چھو کر آئی تھی ہوا

یوں خیال آتا ہے اُس کا یاد آئے جس طرح
گرمیوں کی دوپہر میں شام کی ٹھنڈی ہوا

اور ابھی سُلگیں گے ہم کمرے کے آئینہ میں
اور ابھی کہسار سے اترے گی برفیلی ہوا

ہم بھی اک جھونکے سے نطف اندوز ہو لیتے تھے ✓
جھولے بھٹکے اس گلی میں بھی چلی آتی ہوا

ایک زہریلا دُھواں چاروں طرف بکھرا گئی
سب کو اندھا کر گئی ایسی چلی اندھی ہوا

اُس نے لکھ بھیجا ہے یہ پیل کے پتے پر مجھے ✓
کیا تجھے راس اُنکئی بجلی کے پتے کی ہوا

کیوں کر اے عابد! بچا پاتا میں اپنی تشنگی
مجھ تک آنے ہی سے پہلے ہو گیا پانی ہوا ۴

میرے انگن سے کبھی ہو کے نہ گزرا سورج
داستہ اپنا کسی دن تو بدست سورج

دن جو نکلا بھی تو جھائے رہے غم کے بادل
دل کی نگرانی پہ کبھی کھل کے نہ چمکا سورج

تہقہ زن ہے مری ہا رہے دشمن میدا
پردہ شب سے پھر ایک بار نکل سورج

اک طرف رات کے شیدامہ داغ کتنے
اک طرف دن کا پرستار اکیلا سورج

غیر ممکن ہے شبِ غم کی سحر اے عابد!
کس نے مغرب سے نکلتے ہوئے دیکھا سورج

کیا کہوں میں کس امتحان میں تھا
قید خود اپنے ہی مکان میں تھا

پر سیٹھے تو یہ ہو محسوس
اور ہی کچھ مڑا اڑان میں تھا

غالبؒ } ہم الملک ہو کے بھی الگ نہ ہوئے
لوٹتا رشتہ درمیان میں تھا

جس کا مذکور ہی نہیں تھا کہیں
میں وہ کردار داستان میں تھا

بے توجہ ہی وہ رہا عابد!
حرفِ ترجمے بیان میں تھا

آفتاب اپنی انا کا ہوں میں
اپنی ہی آگ میں جلتا ہوں میں

بوند مانگی تو سمندر پایا
پھر بھی حیرت ہے کہ پیاسا ہوں میں

غمِ اُمردن میں اُلجھا ہوں ابھی
بے نیاز غمِ فردا ہوں میں

ناز کرتا ہوں میں خود پر ایسے
جیسے تیرا ہی سراپا ہوں میں

خود سے ہو جاتا ہوں کچھ اور بھی دور
اپنے نزدیک جب آتا ہوں میں

کیا کہوں میں کس امتحان میں تھا
قید خود اپنے ہی مکان میں تھا

پر سیٹے تو یہ ہو محسوس
اور ہی کچھ مزا اُڑان میں تھا

غائب } ماتم الگ ہو کے بھی الگ نہ ہوئے
لوٹتا رشتہ درمیان میں تھا

جس کا مذکور ہی نہیں تھا کہیں
میں وہ کردار داستان میں تھا

بے توجہ ہی وہ رہا عابد!
حرف ترجمے بیان میں تھا

آفتاب اپنی انا کا ہوں میں
اپنی ہی آگ میں جلتا ہوں میں

بوند مانگی تو سمندر پایا
پھر بھی حیرت ہے کہ پیسا ہوں میں

غمِ اُمر و ز میں اُلجھا ہوں ابھی
بے نیاز غمِ فردا ہوں میں

ناز کرتا ہوں میں خود پر ایسے
جیسے تیرا ہی سراپا ہوں میں

خود سے ہو جاتا ہوں کچھ اور بھی دُور
اپنے نزدیک جب آتا ہوں میں

پہلے خود آگ لگا دی گھر کو
خود ہی اب محو تماشا ہوں میں

آج بھی ٹوٹ کے بادل برسا
آج بھی صورتِ صحرا ہوں میں

جانتا ہوں میں حقیقت اپنی
تیرا ادنیٰ سا کرِ شما ہوں میں

گھیر لیتی ہیں مجھے دیواریں
شب گئے گھر جو پلٹتا ہوں میں

حرف ناگفتہ تھا جب زندہ تھا
اب مگر ایک صحیفہ ہوں میں

کوئی تو ہے مرے اندر عابد!
ورنہ کیوں خود سے بھی ڈرتا ہوں میں

پُر امید اور نہ مایوس ہی ہونے دے گا
سنسنے دے گا مجھے پل بھر نہ وہ رونے دے گا

بخش دے گا وہ مجھے سات سمندر لیکن
ایک قطرے سے لبوں کو نہ بھگونے دے گا

دن میں سورج کی شعاعوں سے بدن جھلیں گے
رات کو چاند بھی تیخ بستہ بچھونے دے گا

آنے دے گا نہ کبھی مجھ کو وہ ساحل کی طرف ✓
نہ ہی گرداب میں کشتی کو ڈبونے دے گا

خواب زاروں ہی میں بھٹکائے گا و تا بحر
جاگنے دے گا مجھے اور نہ سونے دے گا!

زہر پینے کے لئے جب کوئی تیار نہیں
پھر وہ کس اُس پر ساگر کو بلونے دے گا

سب کو مصروف وہ رکھے گا جہاں میں عابد
خواب کو لیکن کبھی نہ نیا پس نہ کھونے دے گا

یوں دُور سے نہ تیشہ آذر دکھا مجھے
مجھ کو تراش کر مرا پیکر دکھا مجھے

ایثارِ عشق سے ابھی نا آشنا ہے تُو
اک روز میرے سانچے میں ڈھل کر دکھا مجھے

مانا کہ میرے پاس نہیں کچھ سوائے دل
تو کوئی شے جو دل سے ہو بہتر دکھا مجھے

کتنا بدل چکا ہوں میں اتنا تو جان لوں
پھر آج میرا رُوپ تُو بھر کر دکھا مجھے

عابد یہ کیا ہوا ہے کہ اپنے ہی گھر میں آج
اک اک سے کہہ رہا ہوں مرا گھر دکھا مجھے

✓
 سرسبز کھیتوں کبھی پیپل کی چھاؤں میں
 ہم گاؤں میں تھے جیسے ہوں ابھی نضاؤں میں

✓
 دہلیز پر چراغ جلاتے ہو کس لئے !
 بھکشو پلٹ کے جا بھی چکے ہیں گچھاؤں میں

✓
 جنگل سے لے تو آئے ہو پودا گلاب کا
 مڑ جھانہ جائے شہر کی باسی ہواؤں میں

✓
 دل آئینہ تھے چہروں پہ چہرے کہیں نہ تھے
 لوگوں نے تن چھپائے نہ تھے جب عبادوں میں

پیا سوں کا اپنے دھیان ہی شاید نہیں اُسے
 گنگا کو جو چھپائے ہوئے ہے جٹاؤں میں

✓
 ہم غش تھے برشکال پہ لیکن خبر نہ تھی
 پوشیدہ بجلیاں بھی ہیں کالی گھٹاؤں میں

خواہش، طلب، اُمید، ہوس، جستجو، لُک
 عابد گھرا ہوا ہوں کئی داستاؤں میں

دھوپ جب بکھری تو کچھ اور ہی منظر نکلا
میں جسے دشت سمجھتا تھا سمندر نکلا

آنے والا ہے وہ اس شہر میں سب کو تھی خبر
ایک بھی شخص مگر گھر سے نہ باہر نکلا

ناپ کر مجھ کو سبھی آج پریشان ہوئے
آسماں بھی نہ مرے تدم کے برابر نکلا

اپنی ناکامی تندیر پہ آذر ہے اُداس
جس کسی کو بھی چھو اریٹا کا پتھر نکلا

کتنا گنجان بہ ظاہر نظر آتا تھا مجھے
اک بیابان مگر شہر کے اندر نکلا

کیا ہی تعظیم سے پیش آئے ہیں دنیا والے
میں جب آج ایک نیا چہرہ لگا کر نکلا

جس کے سر تھا ہر اک الزام روایت کوشی
اک نئے دور کا عابد وہ پیمبر نکلا

نگر نگر دل مضطر لیے پھرا مجھ کو!
مجھے تلاش تھی جس کی نہ مل سکا مجھ کو

میں آنندھیوں سے لڑوں گا یہیں سوچا تھا
ہوا کا ایک ہی جھونکا بچھا گیا مجھ کو

جتن کرو مجھے واپس زمیں پہ لانے کا
نہ ایسا ہو کہ نکل جائے یہ خلا مجھ کو

میں اُس کے بارے میں کچھ اُس پوچھتا لیکن
ملا وہ جب کبھی بھرا ہوا ملا مجھ کو!

یہ سچ ہے اس میں کسی دوسرے کا ہاتھ نہیں
تباہ کر گئی ہے خود مری انا مجھ کو !!

میں اپنے آپ میں کھویا ہوا تھا صدیوں سے
کہاں کہاں وہ مگر ڈھونڈتا رہا مجھ کو

مری وفا کا اُسے بھی ہے کس قدر احساس
وہ کتنے دکھ سے یہ کہتا ہے "بھول جا مجھ کو"

کٹی ہے کرب و بلا میں تمام عمر مری
حیات لگتی ہے میدانِ کربلا مجھ کو

میں ایک راز تھا دنیا کے واسطے عابد
اُس اک نظر نے مگر فاش کر دیا مجھ کو

پانیوں پر نقش، خوشبوؤں کے پیکر دیکھنا
آنکھ مانگے ہے فقط اُن دیکھے منظر دیکھنا

کس جزیرے پر نظر آئے گی ہریالی مجھے!
اور ابھی قسمت میں ہیں کتنے سمندر دیکھنا

✓ ایک رستہ اُن گنت رستوں کا بن جا کا جال
اس طلسمی دشت میں پیچھے نہ مڑ کر دیکھنا

✓ کچھ پُرانے جھونپڑے ساحل پہ باقی ہیں ابھی
شاید ان میں کوئی مل جائے شناور دیکھنا

کوئی آکر جھونک دیتا ہے مری آنکھوں میں ہول
چاہتا ہوں خود کو جب اپنے برابر دیکھنا

ریزہ ریزہ ہو کے کلیوں میں بکھر جاؤ گے تم
ایک دن میز پر طرح گھر سے نکل کر دیکھنا

کر دیا تقسیم اسے بھی سرحدوں کی ضرب نے
کیوں کرا اب ممکن ہوا ہے عابد اُمناد دیکھنا

آندھی چلی کچھ ایسی بکھرنا پڑا مجھے
جینے کی آرزو تھی کہ مرنے پڑا مجھے

دل میں تھی روشنی کے جزیروں کی آرزو
اندھے سمندروں میں اترنا پڑا مجھے

اک دن کسی نے دیکھا تھا کھڑکی سے جھانک کر
پھر اس گلی سے روز گزرنا پڑا مجھے!

ناقابلِ معاف سہی جرمِ سرکشی
مجبور تھا گناہ یہ کرنا پڑا مجھے!

روکا ہوا تھا گردشِ دوراں نے راستہ
کچھ دیر مے کدے میں کھٹنا پڑا مجھے

جلنے پناہ مل نہ سکی آسمان پر
واپس اسی زمیں پہ اترنا پڑا مجھے!

دھوکے کچھ ایسے کھائے ہیں سایوں کے شہر میں
عابد خود اپنے آپ سے ڈرنا پڑا مجھے

وفا کے مرحلے کتنے کڑے ہیں
ہم اپنے آپ سے اکثر لڑے ہیں

یہ کیسے شہر میں آج آگئے ہم
یہاں بولوں کے قد کتنے بڑے ہیں

عجب وہ ایک جھونکا تھا ہوا کا
تناور پیر بھی اوندھے پڑے ہیں

ملن کی پیاس بجھ پائے تو کیوں کر
ابھی راتیں ہیں چھوٹی دن بڑے ہیں

۷
۱۷

ملی ہے یہ نزا سچ بولنے کی
زباں پر ان گنت چھالے پڑے ہیں

✓ جنھیں اُس پار اُترنے کی لگن ہے
انھیں کے ہاتھ میں کچے گھڑے ہیں

جہاں کل تک سہا اُسیبوں کا مسکن
اُسی پیل پر اب جھولے پڑے ہیں

ابھی انسانیت زندہ ہے عابد
✓ ابھی اس شہر میں کچھ جھونپڑے ہیں

مُخُونِ مِی لَت پَت سُمندَر دیکھنا تھا
دُوبتے سَورج کا منظر دیکھنا تھا

مِی اسی دِن کے لئے زندہ تھا شاید
خود کو اپنے گھر مِی بے گھر دیکھنا تھا

ہم زمیں والے یہاں کس حال مِی ہیں
اُسما نوں نے اُتر کر دیکھنا تھا

بے سبب گرمی نہ تھی میرے لہو مِی
جو ہر تیغِ ستم گر دیکھنا تھا

دھول اُن آنکھوں مِی جھونکی گئی تھی
جن کو وہ بے سایہ پسِ کمر دیکھنا تھا

شہر مِی کتنے ہی دروازے کھلے تھے!
اک نہیں تو دوسرا گھر دیکھنا تھا

اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر اک دِن
برف پر عابدِ پُسل کر دیکھنا تھا

پھولوں کی دل نواز پھبن کو ترس گئے
اہلِ چین بہارِ چین کو ترس گئے

جب سے ہمارے شہر میں سورج مقیم ہے
ہم روشنی کی ایک کرن کو ترس گئے

جس کی سیاہ آنکھوں سے اُجلی ہے کائنات
اہلِ دل اُس غزالِ حقن کو ترس گئے

سرشار اگرچہ بادۂ تو سے ہیں پھر بھی ہم
مستیِ شراب کہن کو ترس گئے

عابد چھپا ہوا ہے کہاں ان دنوں کہ ہم
اُس تاجدارِ ملکِ سخن کو ترس گئے

یہ جانتا ہوں وٹا کرے گا جہاں کیسی
بجائے بیٹھا ہوں پھر بھی دل کی دوکان کیسی

یہ بات الگ ہے کہ اب پلٹ کر نہ آئیں گے
مگر تھی اس بار پچھنیوں کی اڑان کیسی

کئی برس سے ہم ایک آنکھ میں رہ رہتے
یہ آج دیوار آگئی درمیان کیسی!

زمین سے تو فرار ہو کر میں آگیا ہوں
مجھے سزا دے نہ جانے اب آسمان کیسی

نہ سوچ میرے بدن پہ آئے ہیں زخم کتنے
یہ دیکھ مسمار کی ہے میں نے چٹان کیسی

نہ واقعہ تھا نہ کوئی کردار اس طرح کا
مجھے سنائی گئی مگر داستان کیسی

سفر کی عابد ابھی تو ہیں سوچ ہی رہا تھا
ساگئی انگ انگ میں یہ تکان کیسی

ان گنت صدیوں سے تنہا نظر آتا ہے مجھے
چاند بھی میرے ہی جیسا نظر آتا ہے مجھے

بے یقینی کے حصاروں میں مقید ہوں میں
اب تو دن میں بھی اندھیرا نظر آتا ہے مجھے

وہ جواک کچا مکاں شہر میں باقی ہے ابھی
ان عمارات سے اُدچا نظر آتا ہے مجھے

اتنا آسان نہیں خود سے گزرنا یا رو
یہ تو ایک آگ کا دریا نظر آتا ہے مجھے

تشنگی میری بچھائے گا یہ کیا اے عابد
خود سمندر ابھی یہاں سا نظر آتا ہے مجھے

سرتابہ پاوہ نور کا پیکر بھی آئے گا
اُجیالی ساعتوں کا پیمبر بھی آئے گا

کاغذ کی کشتیاں ہی سہی ساتھ لے چلو
رستے میں اک انتہاء سمندر بھی آئے گا

بے وجہ تو نہیں درو دیوار منتظر
پردیس جو گیا ہے پلٹ کر بھی آئے گا

شعلوں کو شوق سے تو ہواؤں کے نیکھ دے
پھیلی جب آگ زد میں تر اگھر بھی آئے گا

اک بار دوستوں پہ ذرا اعتبار کر
پھر دیکھ تیری پیٹھ پہ خنجر بھی آئے گا

دروازے، کھڑکیاں سبھی چاہے تو بند رکھ
باہر اگر ہے شور تو اندر بھی آئے گا !

عابدِ سیاہ رات کا ہو گا کبھی تو آنت
پیشِ نگاہ صبح کا منتظر بھی آئے گا

عجب شور ہر سو ہے پھیلا ہوا
سنا اُن سنا ایک جیسا ہوا

یہ سب جان کر بھی کہ پیاسا ہوں میں
کبھی آپ کا دل نہ دریا ہوا

حقیقت مری ایک نقطہ سہی
اک اک سمت لیکن ہوں پھیلا ہوا

خطا کون سی مجھ سے سزا ہوئی
مرا شہر میں کیسے شہرا ہوا

مرے ہونٹ تو آپ نے سی دیے
اگر میری چُپ کا بھی چرچا ہوا؟

پرندہ بھی کوئی ہوا میں نہیں
چلو گھر چلیں اب اندھیرا ہوا

سر عام کچھ کہنے والا تھا وہ
خدا جانے عابد کہ پھر کیا ہوا

کیا نہ کیا ان گنت صدیوں پرانے راستے
یاس کا کہر ہے اور اندھے ہیں سارے راستے

✓ ایک دن بے نام ہو جائیں گی سب یگڈنڈیاں
پھیل جائیں گے یہاں بھی لمبے چوڑے راستے

✓ کھیت، بجر، پیڑ تنگے، سب کنوئیں بے آب ہیں
جب سے پکے ہو گئے گاؤں کے کچے راستے

کب تک آخر ہم سفر رہتے ہمارے ہم سفر
مختلف سمتوں میں جب بکھرے ہوئے تھے راستے

گم رہی کا بے جہت صحرا ہے تا حدِ نظر
کر دیے ہیں بے نشاں تند اندھیوں نے راستے

کچھ عجب لذتِ عذابِ آبلہ پانی میں ہے
ورنہ ہم کیوں منتخب کرتے کھیلے راستے

✓ جس طرف جی چاہے اے عابد! ترا چل اُس طرف
ایک ہی منزل پہ جا ملتے ہیں سارے راستے

چمن میں اڑتی پھرتی تیتلیوں کو کون پوچھے گا
جو تم آجاؤ تو ان گل رنخوں کو کون پوچھے گا

یہاں کے لوگ اپنے آپ سے بھی جب نہیں وقف
پرائے شہر میں پردیسیوں کو کون پوچھے گا !

سمندر پھیل کر آپہنچا ہے بنجر پہاڑوں تک
اب اے تالاب ! تیری پھیلیں کو کون پوچھے گا

عجب یکسانیت کی دُھند کا پردہ ہے آنکھوں پر
یہاں ہریل بدلتے منظر وں کو کون پوچھے گا

آہیں اک رہ گئے ہیں آخری آذر یہاں عابد
ہمارے بعد بے جاں پتھروں کو کون پوچھے گا

لشکرِ فصیلِ شہر تک آکر پلٹ گیا
بے جنگ کیسے آج سکندر پلٹ گیا

موتی وہ کیوں بکھیرتا اندھوں کے سامنے
دریا سے خالی ہاتھ شنادر پلٹ گیا

شاید مرے لہو کے نمک میں کشش نہ تھی
سینے تک آکر آج بھی خنجر پلٹ گیا

دل کی گلی بھی بھول بھلیتوں سے کم نہ تھی
حیران ہیں سبھی کہ میں کیوں کر پلٹ گیا

دریا کے بدلے سامنے تھا ایک ریگ زار
سورج غروب ہوتے ہی منظر پلٹ گیا

غرقاب کرتا آیا تھا کتنی ہی بستیاں !
صحرَا کو دیکھتے ہی سمندر پلٹ گیا

اس بے حسوں کے شہر میں عابدِ وفانہ ڈھونڈ
مجھ تک وہ آیا اور یہ کہہ کر پلٹ گیا

آپ اپنے سے جو بچھڑوں تو یہ منظر دیکھوں
ورنہ مشکل ہے کہ خود کو ترے در پر دیکھوں

شاید آجائے مرے ہاتھ بھی کوئی موتی
کیوں نہ اک روز سمندر میں اتر کر دیکھوں

صرف اس جرم پہ رکھا گیا پیسا سا مجھ کو
میں نے چاہا تھا کہ ہر ہاتھ میں ساغر دیکھوں

گردشِ شام و سحر ہی کو نہ دوں ہر الزام
کھومتی ہے یہ زمیں جس پہ وہ محور دیکھوں

منتظر ہوں میں اب اُس وقت کا جب اے عابد
ہر طرف اپنے سمندر ہی سمندر دیکھوں

✓ سورج طلوع ہونے کا منظر بھی دیکھ لے
اک روز خواب گاہ سے باہر بھی دیکھ لے

کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے ہیں صلیب پر
ہیں آزمائشوں میں یمبر بھی دیکھ لے

✓ دشتِ بلا میں گھوم بگولوں کے ساتھ ساتھ
چلتا ہے کیسے وقت کا چکر بھی دیکھ لے

مانا کہ تشنگی تری صبر کی دین ہے !
فیاض کس قدر ہے سمندر بھی دیکھ لے

کھاتے ہیں زخم پیٹھ پہ اینٹوں کے درمیاں
اب دستِ غیر میں ہے جو خنجر بھی دیکھ لے

سیج بات کہنے کے لئے اپنی زبان کھول
پھر کس طرف سے آتے ہیں پتھر بھی دیکھ لے

سر پر بلا کی دھوپ رہی ہے تمام دن
اب سرد شب کی اوڑھ کے چادر بھی دیکھ لے

دنیا کو تو نے دیکھا ہے کھڑکی میں بیٹھ کر
اک روز اپنے گھر سے نکل کر بھی دیکھ لے

✓ برجستہ شعر کہنے میں عابد ہے منفرد
ہے ایسا کوئی اور سخنور بھی دیکھ لے

میں اُس کے سامنے ہوں پھر بھی ڈھونڈتا ہے مجھے
عجیب شخص ہے مجھ سے چھپا رہا ہے مجھے

بغیر اس کے نہیں کیا مری کوئی پہچان !
تو میرے نام ہی سے کیوں پکارنا ہے مجھے

اگر یہ سچ ہے تو پھر کس طرح میں زندہ ہوں
زمانہ کہتا ہے اُس نے بھلا دیا ہے مجھے

میں اُس کے قد کے برابر ہوں کب یہ میں نے کہا
یہ آسمانِ عیش کیوں ستارہا ہے مجھے

تمام شب کیا کسب ضیا مجھی سے مگر
سحر کے اُتے ہی اُس نے بچھا دیا ہے مجھے

✓ قریب سے وہ گزرتا ہے بے نیازانہ
جب اُگے بڑھتا ہے مڑ مڑ کے دیکھتا ہے مجھے

رُکا تھا راہ میں پل بھر اس ایک لغزش نے
ہمیشہ کے لئے پتھر بنا دیا ہے مجھے !!

میں گھر سے نکلا ہی تھا اپنی جستجو میں ابھی
وہ بن کر آئینہ مجھ سے ملا گیا ہے مجھے

ضرور مجھ میں کوئی خاص بات ہے عابد
جو شخص ملتا ہے مجھ سے وہ سوچتا ہے مجھے !

مجھ سے میرا سایہ تک بھی چھین کر لے جائے گا
رات جب آئے گی سورج بھی دغا دے جائے گا

زندگی بھر وہ سمندر میں رہے گا غوطہ زن
پھر بھی اپنے ساتھ کربِ تشنگی لے جائے گا

کس کو یہ معلوم تھا پیش آئے گا وہ اس طرح
مسکراہٹ چھین لے گا اشکِ غم دے جائے گا

کھو گیا پُر نورِ خوابوں کی دمک میں وہ اگر
صبح کا خوش رنگِ منظر دیکھنے سے جائے گا

غرقِ گردِ آبِ بلا کر دے کہ ساحلِ بخش دے
کیا خبر طوفاں مری کشتی کہاں لے جائے گا

خود گمستاں میں وہ ٹوٹے گا بہادری کے مزے
کاغذی پھولوں کا گلہ ستہ بچھ دے جائے گا

اک اسی اُمید پر عابد ہوں ہر گرم سفر
شوقِ منزل ہی ہر منزل مجھ لے جائے گا

فرصت ملی دُنیا سے تو ہم بات کریں گے
خود سے بھی کسی روز ملاقات کریں گے

کب آئے گا وقت، ایسے بھی جب چھائیں گے بادل
صحراؤں پہ جو پھولوں کی برسات کریں گے

ہم ہر بہ لب ہو چکے لیکن ابھی منصف
کچھ اور بھی تجویزِ مکافات کریں گے

عابد سفرِ دشت سے آئے ہیں پلٹ کر
ہم پیش آئے کون سی سوغات کریں گے

ان گنت ان دیکھے رستوں سے گزرنا ہے مجھے
جب کہیں جا کر سمندر میں اترنا ہے مجھے

میرے انگن میں بھی اے قوس قزح اک دن اتر
زندگی میں تیرا اک اک رنگ بھرنا ہے مجھے

دیکھتا ہوں کیوں کھنے پیڑوں کے سایوں کی طرف
جب ہر منزل پہنچ کر ہی ٹھہرنا ہے مجھے!

آج اک کچے گھرے پر پھر یہی تحریر ہے
غریب دریائے وفا ہو کر اکھبرنا ہے مجھے

میرے تلواروں میں جو چھالے ہیں وہ بے مہر نہیں
آخر اس صحران کو بھی سیراب کرنا ہے مجھے

کب تک آخر میں رہوں گا خود میں ہی سٹا ہوا
اک نہ اک دن تو بہر صورت بکھرنا ہے مجھے

خود کو رکھوں یا نہ رکھوں عابد اس فہرست میں
آج اپنے دشمنوں کا ذکر کرنا ہے مجھے!

اپنے وجدان کے آئینے میں دیکھا جاؤں
کاش میں خود سے الگ کر کے بھی سوچا جاؤں

میں ہوں مجبور کہ ہوں جھیل کا تیدی در نہ
موج در موج اُچھلتا ہوا بہت جاؤں

نام اُس کا جو کوئی لے تو بھڑائی اُنکھیں
جام بریز کی مانند چھلکتا جاؤں !

بار بار ایسے اُچھا لو نہ مجھے سونے فلک
کہیں ایسا نہ ہو سورج سے میں ٹکرا جاؤں

شہر کی بھیڑ میں کھو بیٹھوں نہ میں اپنا وجود ✓
خود کو گھر ہی میں رکھوں باہر اکیلا جاؤں

اس سے پہلے کہ نکل جائے سمندر مجھ کو
اُبرز بن کر کسی صحرا پہ برستا جاؤں !

اپنی قربت کا ہے احساس ابھی اے عابد
اتنا تنہا بھی نہیں ہوں کہ میں گھرا جاؤں

کوئی دستک، کوئی سہ گامہ، نہ کوئی تہ قبا
شہر میں ہوتے ہوئے بھی گھر مرا صحرا میں تھا

کس میں ہمت تھی بیاں دیتا جو سورج کے خلا
رات کے سر ہی رہا الزام دن کے قتل کا

✓ کبرہ کچھ ایسا پڑا دونوں ہی پتھر ہو گئے
مجھ میں اور اُس میں تھا ورنہ دو قدم کا فاصلہ

✓ یوں تو میرے ساتھ اترے تھے کئی میدان میں
میں اکیلا ہی مگر دشمن کے لشکر سے لڑا

اُس کی اک اک بات تھی تردید کے قابل مگر
جو بھی وہ کہتا رہا چپ چاپ میں سنتا رہا

جب نیا آیا تھا میں نے بھی تو سوچا تھا یہی
کس طرح اس بے مروت شہر میں رہ پاؤں گا

کر دیا سب کو اپنا بیج دو پہر کی دھوپ نے
کس کی انگلی تھام کر جلتی یہ بے چاری ہوا

اپنا خالی چہرہ لے کر پھر رہا ہوں شہر میں
وہ مری پہچان بھی مجھ سے چپرا کر لے گیا

دیکھتا رہتا ہوں عابد نیند کی پریوں کا قص
میرے انگن میں ہوا کرتا ہے اکثر رات جگا

بھروسہ اتنا بھی اچھا نہیں کتابوں پر
 کبھی تو کیجئے کچھ اعتبار آنکھوں پر

کسی پر کون لگانے کا قتل کا الزام
 ہے ایک دوسرے کا خون سب کے ہاتھوں پر

تھا حرف حرف کبھی جن کا چشمہ انوار
 جی ہے گردی تہہ آج اُن صحیفوں پر

مرے بچاؤ کی خاطر کوئی بھی در نہ کھلا
 اگر چہ آنکھیں تھیں چسپاں سبھی درتچوں پر

بلا جو دھوپ کا اک لمس بے وجود ہوئے
یقین میں نے کیا بھی تو کیسے رنگوں پر !

حقیقتوں کی صلیبوں پر آج لٹکے ہیں
ممتا اعتماد بہت جن کو اپنے خوابوں پر

پڑا ہوا ہے عجب قحط غم گساروں کا
چھڑک لو آج نمک خود ہی اپنے زخموں پر

ہمارے ہونے کی دی جانے کی سزا یہ ہیں
نہ لکھا جائے گا کچھ بھی ہمارے کتبوں پر

گھروں سے لوگ نکل کر کہاں گئے عابد
تام شہر میں ہیں قفس کیوں مکالوں پر

بخشے گئے ہیں جو تجھے کرب و عذاب لکھ
اپنا فسانہ اے دل پُر اضطراب لکھ

تین جفا کو چوم کے کر خود کو سُرخ رُو
اپنے لہو سے اپنی دُنیا کی کتاب لکھ

مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج پر غور کر
دُن کی شکست اور شفق کا عذاب لکھ

کہہ کر شکست خوردہ مرا حوصلہ نہ توڑ
نا کامیوں میں ہی تو مجھے کامیاب لکھ

وہ شہر کا رئیس ہے کچھ تو ہو اُمتیاز
سب کو جناب اور اُسے عالی جناب لکھ

ایک جانے کب کہاں سے اُٹھے کوئی سرفروش
ہر سنگ رہ گزار پہ تو اُفتلاب لکھ

عابد نہ کہہ سکے گا تو ہر بات رُو بہ رُو
اُس کے اک اک سوال کا خط میں جواب لکھ

جو گیوں کی صورت آوارہ رہے بے گھر رہے
فرق کیا ہم شہر میں یا شہر سے باہر رہے

ہم میں پوشیدہ جو پیکر نھانہ ظاہر ہو سکا
آذروں کے درمیاں رہ کر بھی ہم پتھر رہے

دھوپ اترتی کس طرح آخر ہمارے صحن میں
وہ بھی تختی کچھ بنے مروت ہم بھی کچھ خود لر رہے

کس قدر تنہا غموں کے محبس بے دریں ہیں
دوستوں کا ذکر کیا ہم خود سے بھی کٹ کر رہے

ایک پل بھی سو نہ پایا آج تک میں سکھ کی نیند

دھکے لگا کرے ہی اے عابد! مرا بستر رہے

اپنے لئے خود آپ ہی آزار ہو گئے
ہم دشمنوں کے ہاتھ کی تلوار ہو گئے

اہلِ خطا کو عہدہ منصف عطا ہوا
جو بے گناہ تھے وہ گنہگار ہو گئے

حیرت کدہ تھا وہ کہ تری جلوہ گاہ تھی
اہلِ نگاہ نقش بہ دیوار ہو گئے

یوں ذوقِ جستجو کو مرے دے گئے ہوا
کھل کر کچھ اند بھی وہ پُرا سرار ہو گئے

دل دار، دل نواز، دل آرام تھے جو لوگ
دل سرد، دل خراش، دل آزار ہو گئے

میں نے ہی پھول بوئے تھے ایک ایک کام پر
میرے لیے ہی راستے پُر حصار ہو گئے

کچھ پل کی تیرگی کا یہ عابد اثر ہوا
سب لوگ ظلمتوں کے پرستار ہو گئے

کوئی اُمید کا تنکا نظر نہ آئے مجھے
کہیں یہ اندھا سمندر نکل نہ جائے مجھے

دُکھوں کی بھیڑ میں خود سے بچھڑ گیا ہوں میں
ہے کوئی ایسا کہیں سے جو دھونڈ لائے مجھے

میں کون ہوں ؟ مرا مصرف ہے کیا ؟ کھلے مجھ پر
کبھی تو کوئی مرے بارے میں بتائے مجھے ! (۶۴)

ہوا بھی مجھ کو نہ لے جائے جانبِ ساحل
نہ اپنی گود میں گرداب ہی چھپائے مجھے

میں اس جنم کا سدا ماہوں در بہ در عابد
کہاں ہے کرشن مرا جو گلے لگائے مجھے !

میں ایک بے نام سی اذیت میں مبتلا تھا
تھا برف سارا بدن مگر ذہن جل رہا تھا

عجیب موسم تھا سب مناظر دھواں دھواں تھے
سفید کاغذ پر خامہ بے حس پڑا ہوا تھا

فضا میں ایک چیخ لحنہ لحنہ ابھر رہی تھی
بیاض خاموش کے میں ادراق اُلٹ رہا تھا

اگر ہوا تیز ہو نہ باہر نکلتا گھر سے
وہ جاتے جاتے مجھے بس اتنا ہی کہہ گیا تھا

بھٹک رہا تھا ادھر ادھر جو چراغ لے کر
اُسی نے سورج کو اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا

چلا گیا ہے وہ مجھ کو بے نام کر کے عابد
جسے میں اپنا ہی نام لے کر پکارتا تھا

شاخوں پہ پرندوں کے چپکنے کی خبر دے
سُورج ہے اگر تو مجھے پیغامِ سحر دے

ادروں کوئے صاف ملے گی جو یہ سچ ہے
جتنی بھی ہے تلچھٹ مرے پیمانے میں بھر دے

امکان کی سرحد سے پرے جانا ہے مجھ کو
لمبی ہے مسافت مجھے اب اذنِ سفر دے

ہو جائے نہ مُنکر کہیں مجھ سے مرا "ہیں" ہی
اک روز مجھے بھی مرے ہونے کی خبر دے

میں تو سرِ قمر بن کے اُبھراؤں گا عابد
تو دیکھنے والوں کو فقط حُسنِ نظر دے

جب سے ہاتھ اپنا اُس کے ہات میں ہے
ہر قدم دشتِ حادثات میں ہے

خود بھی شاید اُسے نہیں معلوم
جو ستم اُس کے اتفات میں ہے

سنگِ باری پھٹا مشغلہ جس کا
وہ بھی شاملِ جنوں صفات میں ہے

ڈھونڈیے بھی تو کس طرح اُس کو
گم جو اپنی تجلیات میں ہے

ذہنِ سرسودہ دائروں کا اسیر
آنکھ تازہ مشاہدات میں ہے

جس کو دیکھا نہیں کسی نے کہیں
تذکرہ اُس کاشش جہات میں ہے

اپنے گھر میں وہ قید ہے پھر بھی
شامل ایک ایک واردات میں ہے

کھولتا ہے جو آسماں کے بھیہد *
خود وہ گردِ توہمات میں ہے

گوشتِ دل سے جو سن رہے ہیں سبھی
بات کچھ تو ہماری بات میں ہے

عقلِ محوِ نظارہ ہے عابد!
عشقِ مصروفِ تجربات میں ہے

کرب بے رنگی کا رنگیں منظروں پر لکھ دیا
تو نے اے صرصر! یہ کیا نازک گلوں پر لکھ دیا

اب کوئی کا گانہ بولے ان مندھیروں پر کہیں
شہر والوں نے مکانوں کی چھتوں پر لکھ دیا ✓

دو پہر کی ٹوسے کمرے کو بچانے کے لیے
”صبح کی ٹھنڈی ہوا“ سب کھڑکیوں پر لکھ دیا سہ

بوند بھر پانی کو ہم اہل زمیں ترسا کیے
کیا کہیں کیا کسی نے اڑتے بادلوں پر لکھ دیا

اور تو کوئی سند دنیا نہ دے پاتی ہمیں
لفظِ ناکامی ہماری کاوشوں پر لکھ دیا

اپنے ہی چہرے کی جب پہچان مشکل ہو گئی
اُس نے بے عکس اُئینہ سب اُئینوں پر لکھ دیا

زندگی بھر ہم رہے کچھ ایسے سرگرم سفر
منزلوں کو راستوں کے پتھروں پر لکھ دیا

ایک انجانے سے رسم الخط میں اے عابد! مجھے
اُس نے بوسیدہ پُرانے کاغذوں پر لکھ دیا

دُھند لائے منظروں کی خبر دے گیا مجھے
یہ کون آکے زخمِ نظر دے گیا مجھے

بے برگ و بار تھے جو شجر دے گیا مجھے
کیا سوچ کر وہ دُھوپ نگر دے گیا مجھے

لوگوں میں بانٹتا رہا جو مسکراہٹیں
مجھ سے ملا تو دیدہ تر دے گیا مجھے

ڈالا ہے اُس نے اب کہ عجب امتحان میں
تیز آنڈھیوں میں ریت کا گھر دے گیا مجھے

بخشتی تھی جس کو میں نے جزیروں کی ملکیت
وہ کالے پانیوں کے بھنور دے گیا مجھے

دیکھا جب اُس نے کوئی نہیں مجھ سا تیز رو
جو ختم ہو کہیں نہ سفر دے گیا مجھے

عابد وہ خود مقیم ہے پھولوں کے شہر میں
صحرائے خارزار مگر دے گیا مجھے

ہر قدم پر گھنے پیڑوں کے خنک سائے تھے
ایک پل بھی نہ مگر اُبلہ پا بھڑے تھے

کوئی دشمن ہی نہ تھا اُس کا جہاں میں شاید
بے فصیل اُس نے کئی شہر بسا رکھے تھے

سرد مہر اتنی کہاں دھوپ ہو اُکرتی تھی
برف صورت کبھی پتھر تو نہیں پگھلے تھے

یہ خبر تھی وہ کسی گھر میں نہ مہاں ہو گا
منتظر پھر بھی اُسی کے سبھی دروازے تھے

کچھ زیادہ ہی سخن فہم تھے وہ اے عابد!
میری فریاد کو بھی نغمہ کہا کرتے تھے

شفا کی آس رہی بھی تو کن میسوں سے
جو آشنا ہی نہیں تھے ہمارے زخموں سے

کہیں یہ آج کا دن ہی نہ روزِ محشر ہو
نکل پڑے ہیں سبھی لوگ اپنی قبروں سے

خود اپنے آپ سے ملنے کی جب نہیں فرصت
عبث نہ وقتِ ملاقات مانگ لوگوں سے

نہ پوچھو ان سے حقیقت کا رنگ کیا ہے
بوابِ یاد کے کیا خواب بگھڑے

ملے گا اور تمہیں کیا سوائے مایوسی
اُجالے مانگتے ہو کیوں سیاہ راتوں سے

حصارِ ذات سے باہر نکل کے دیکھ ذرا
تری تلاش میں دُنیا ہے کتنی صدیوں سے

خنک ہواؤں میں بھی کس بلا کی حدت ہے
یہ راز پوچھ سکتے ہوئے چناروں سے

گزر نہیں کسی آسیب کا یہاں عابد
ڈرے ہوئے ہیں سبھی لوگ اپنے سالیوں سے

بادل برس کے دشت کی کایا پلٹ گیا
صدیوں کا جو غبار تھا پل بھر میں چھٹ گیا

اے موجہ ہوا! تجھے کیا آگیا خیال
تو کیوں مری کتاب کے اوراق اُلٹ گیا

تقلیدِ کوہ کن پہ مجھے یہ سزا ملی
خود اپنے تیشے ہی سے مرا ہاتھ کٹ گیا

اندھی چلی کچھ ایسی بلا خیز شہر میں
ایک ایک چہرہ گردِ اذیت سے اٹ گیا

طوفاں سے لڑتے لڑتے بہت تھک گیا وہ جب
ساحلِ سمجھ کے موجِ بلا سے لپٹ گیا

عابدِ لغت پہ جمتی گئیں گرد کی ہتھیں
ہر لفظ اپنے رشتہ معنی سے کٹ گیا

کتنا بے حس ہوں کہ اتنا بھی پتہ چلتا نہیں
میرے اندر کا خلا پُر ہو چکا ہے یا نہیں

پھر گلی میں تنقبہ اُبھرے ہیں ہر دن کی طرح!
آج حیراں ہوں کہ میں کھڑکی سے کیوں جھانکتا ہوں

ازرہ تفریح اپنے گھسے نکلا ہے مگر
یہ ہے بازارِ اذیت اُس کو اندازا نہیں

میرے چہرے سے نہ جانے اُس نے کیا کچھ پٹھ لیا
ایک لمحہ بھی مرے کرے میں وہ ٹھہرا نہیں

کس قدر مجبور ہیں بے بس ہیں ہم اس دور میں
عابد اپنے آپ پر بھی اختیار اپنا نہیں

دُشمنوں میں گھرا ہوا ہوں میں
کتنا محفوظ ہو گیا ہوں میں

کون سے حرف میں چھپا ہوں میں
اپنی آواز دھونڈتا ہوں میں!!

کوئی تو ہے وہ جس کی خاطر آج
آپ اپنے سے لڑ پڑا ہوں میں

میں ہوں انمول یہ خبر ہے مجھے
مہر بھی بے مول یک رہا ہوں میں

یا تو الفاظ بے معانی ہیں
یا کوئی دُور کی صدا ہوں میں

فریادِ تیرا جاذبِ بیت نہ کوئی لطف و سرور
کیسے جینے پہ مر رہا ہوں میں

کیوں نہ تعبیر سے رہوں محروم
دن میں بھی خواب دیکھتا ہوں میں

اُن سے کچھ اس طرح مخاطب ہوں
جیسے اشعار کہہ رہا ہوں میں

عہدِ نو کے لغت میں اے عابد!
لفظِ احلاص ڈھونڈتا ہوں میں

کسے پینے پلانے کی لاکٹ تھی
ہماری دوڑ ہی مے خانے تک تھی

کوئی تو تھا حریف ظلمتِ شب
وہ چاہے ایک جگنو کی جھمک تھی

اگر چاہا نہ تھا اُس گل بدن کو
مری سانسوں میں پھر کس کی بہک تھی

✓ ہم آپس میں مزاجاً مختلف تھے
یہی اک بات تھی جو مشترک تھی

کسی کے تہقے کا بھتا وہ سرگم
کہ چاندی کے کٹورے کی کھنک تھی

ذرا بے برگ پیسٹروں سے پر پوچھو
ہوا پہلے بھی کیا اتنی خنک تھی

مری تاریک راتوں میں بھی عابد
کئی پُر نور خوابوں کی دمک تھی

اُج بھی کل کی طرح اُنکے غبار اُلو دھتا
خود بھی حیراں تھیں گھر پر کس طرح موجود تھا

جانے اپنی کون سی خوبی کھٹکتی تھی مجھے !!
اُپ ہی حاسد تھا میں اور اُپ ہی محسوس تھا

میں نے پہچانا نہیں تھا جب تک اپنے آپ کو
حلقہ احباب میرا کتنا لا محدود تھا

کب تک آخر خود کو رکھ سکتا میں سرگرم سفر
سامنے میرے فقط میدانِ ہست و بود تھا

غم نہ ہوتا نقدِ جاں بھی میں لٹا دیتا اگر
دل کی بازی میں تو لے عابد! زیاں بھی سوتھا

یہ کس نے بخش دیا کربِ انتظار مجھ
بھری بہار میں ہے حسرتِ بہار مجھ

مرے سخن کا مقدر تھی معینوں کی دھوپ ✓
کہیں ملا نہ کوئی لفظ سایہ دار مجھ

میں اب تو سات سمندر کا کڑچکا ہوں سفر
کسی جزیرہ سرسبز پر اتار مجھ !

کبھی یہ دیکھ کہ ہے مجھ میں حوصلہ کتنا
کبھی تو اپنے حریفوں میں کر شمار مجھ

نیکل چکا ہوں میں خود ہی تمام قوسِ قزح
تباہ کر گیا رنگوں کا کاروبار مجھ

میں اپنے آپ سے بے اعتنائی ہو جاؤں
نہ دیکھ ایسے پلٹ کر تو بار بار مجھ

فرار کی کوئی صورت ہی اب نہیں عاب
ملی ہوئی ہے عجب قید بے حصار مجھ

اے اہلِ گلستاں! کبھی وہ بھی زمانہ تھا
ایک ایک شاخِ گل پہ مرا آشیانہ تھا

جس سے خنک ہوا کی توقع رہی ہمیں
اُس بوڑھے پیڑ پر کوئی پتہ ہر آنہ تھا

پڑھ کر سنارہا تھا وہ کیا کیا حکایتیں
ساری کتاب کوری تھی کچھ بھی لکھا نہ تھا

میرے وجود کا تھا یہ پُر درد سانحہ!
اپنے ہی گھر میں مجھ سے کوئی آشنا نہ تھا

عابد تمام شہر میں پہچان تھی مری!
جب تک میں اپنے آپ کو پہچانتا نہ تھا

چاروں طرف فضا میں ہے بکھرا ہوا دھواں
اس چٹنیوں کے شہر میں تازہ ہوا کہناں

تم آج پہلی بار میاں آئے ہو یہاں
صحراؤں میں تو روز ہی چلتی ہیں آنندھیاں

محفوظ رہ سکوں گا میں آخر تو کس طرح
پیروں تلے زمیں ہے نہ سر پر ہی آسماں

جیتے دنوں کی یاد بھی ان میں کیوں نہیں
سوئی پڑی ہوئی ہیں دلوں کی حویلیاں

آتش نشاں پہاڑ ہیں کس کو تھی یہ خبر
ہم تو محکم ہوا کے لیے آئے تھے یہاں

جتنے بھی تھے جہاز وہ غرقاب ہو گئے
عابد پلٹ کر آگئیں کاغذ کی کشتیاں

مہر و مہ کتنی بار کہنائے
کھپر بھی اہلِ زمین نہ شرمائے

خالی خالی سے لگ رہے ہیں ہم
کچھ کہیں جیسے آج بھول آئے

ایسا موسم کبھی نہ دیکھا تھا
✓ شاخ سرسبز پھول زرد دے

بے صدا شور میں تھے ہم غلطاں
اپنی آواز بھی نہ سن پائے

کیا ہے اوتارِ زرد پتوں کی
کون عابد ہوا کو سمجھائے

✓ کہا جو راجت ایک لمحہ بخش دے مجھ کو
تکام رنج و آلم اُس نے دے دیئے مجھ کو

ہوا تھمے گی کبھی اس کا انتظار نہ کر
بکھر رہا ہوں میں آکر سمیٹ لے مجھ کو

جنوں کہے نہیں صحر کی وسعتوں کا جواب
ہجوم شہر مگر راستہ نہ دے مجھ کو

سجائے چاہے تھے میں نے تو خود پہ باتوں رنگ
مگر یہ رنگ ہی بے رنگ کر گئے مجھ کو

جنم جنم سے مجھے انتظار ہے جس کا
وہ ہے بھی یا نہیں کچھ تو بتہ چلے مجھ کو

کٹھن نہ تھا مرا ملنا مگر کتنی شرط اتنی
بجھا کر آنکھوں کو اپنی وہ ڈھونڈتے مجھ کو

چھپا ہوا تھا میں زیر زمین مگر عابد
خلا کے دشت میں وہ ڈھونڈتے رہے مجھ کو

ابر باراں میں جھلستا ساون
کبھی دیکھنا نہ سکتا ایسا ساون

ساتھ لے آتا ہے یادیں کتنی
کبھی آتا نہیں تنہا ساون

کوئی کمرے سے نہ باہر نکلا
صحن میں کس کو بھگوتا ساون

کوئی جھولانہ پڑا پیسل پر
اب کے بے رنگ ہی گزرا ساون

کھل گئی تو سب قزح اے عابد
آگیا رنگ برنگ ساون

اتنے رُخ اپنے دیکھ کے حیران ہوں بہت
اُغینہ توڑ کر میں پریشان ہوں بہت

صحرا ہے دل مرا یہ کوئی جانتا نہیں
سب کی نظر میں شہر ہوں گنجان ہوں بہت

کرتار ہا ہوا کا تعاقب تمام عمر!
یہ سچ ہے دوستو! کہ میں نادان ہوں بہت

مجھ سے ملا رہا ہے مجھے کوئی اس طرح
جیسے میں اپنے آپ سے انجان ہوں بہت

ظلمت اُگل رہا تھا یہ سورج بہ جانے نور
کتنا عجیب خواب تھا حیران ہوں بہت

کچھ اور بڑھ گیا مرا احساسِ تشنگی!
چھو کر سمندر آج پشیمان ہوں بہت

عابد ہے مثل شہرِ خموشاں مرا وجود
آباد اتنا ہو کے بھی دیران ہوں بہت

بھاگتی یوں البیلی دھوپ
صحراؤں نے لے لی دھوپ

✓ ابر چھٹا تو مجھ کو لگی !
دُہن نئی نویلی دھوپ

قدم قدم پر پیڑ ہی پیڑ
پھیر بھی ہم نے جھیلی دھوپ

جب بھی اس پر غور کیا
بن گئی ایک پہیلی دھوپ

توس ترخ کے رنگ بنے
بکھری جب البیلی دھوپ

✓ پریت، میداں، گلشن، دشت
عابد سب کی سہیلی دھوپ

حُسنِ اخلاصِ اک بھرم نکلا
پردہ لُطف میں ستم نکلا

ہو گئیں اور اُونچی دیواریں
گھر سے باہر نہ پھر قدم نکلا

کیا کہیں دل شکستگی کا راز
خود پہ اپنا ہی یہ کرم نکلا

سینکڑوں کوس کا سفر تھا مگر
فاصلہ اک قدم سے کم نکلا

وہ بھی کچھ مجھ سے دُور دُور رہے
ان دنوں میں بھی گھر سے کم نکلا

گوئیے الفاظ کیا بتائیں گے
کس طرح معینوں کا دم نکلا!

ہم تو کچھ اور ہی سمجھتے تھے !
عابد اک صاحبِ قلم نکلا

ہمدردیوں کو چھوڑ کے بے درد ہو گئے
ایسی ہوا چلی سبھی دل سرد ہو گئے

میٹھے سمٹائے لوگوں نے منزل کو جالیا
جو تیز گام تھے وہ سفر گرد ہو گئے

سینہ پیر تھے جو اُنھیں بُزدل کہا گیا
زخمی تھی جن کی پیٹھ وہ پامرد ہو گئے

عابد کب آئے آپ چناروں کی چھاؤں
پتھر اک ایک بیڑے کے جب زرد ہو گئے

وہ کیسا خواب تھا پچھلے پہر جو دیکھا تھا
خود اپنے آپ ہی سے میں پلٹ کے رہا تھا

سبھی سے پوچھ رہا ہے اب اپنے بارے میں
اک ایک شخص کو جو آئینہ دکھاتا تھا

پلٹ کر آیا ہوں رُخ پر سیاہ رات لیے
میں آفتاب کی مانند گھر سے نکلا تھا

ہوئی تھی جس سے ملاقات کچھ برس پہلے
وہ کوئی اور تھا لیکن ترے ہی جیسا تھا

سُمندروں کے سفر میں کئی کو لمبس تھے ✓
میرا وجود ہی اک بے شجر جزیرا تھا

اکیلا میں ہی نہ تھا جستجو میں سرگرداں
اک ایک ہاتھ میں اندھی گلی کا نقشہ تھا

کسی نے ہاتھ ہی اُس کے چُرا لیے عابد
وہ آج در نہ مجھے قتل کرنے والا تھا

کیا غلط ہے کیا بجا ہے یہ کبھی سوچا نہ کر
 مسکھ سے رہنا ہے تو اپنے آپ سے اُلجھانہ کر

پیر وی گوتم کی کرنا اس قدر آساں نہیں
 زندگی کو چشمِ عبرت سے کبھی دیکھا نہ کر

خود کو کھو بیٹھے گا اک دن ہم نہ کہتے تھے تجھے
 شب گئے اُس پیر کے نیچے سے لو گزرا نہ کر

اپنی ہی نظروں سے تو خود بھی نہ گرجائے کہیں
 اس قدر نزدیک سے ہر شخص کو دیکھا نہ کر

رہ گیا ہے اک یہی لے دے کے تیرا آئینہ
 دل کو اسے جا بجا غموں کی دھول سے میلانہ کر

یہ شب تاریک گھنا جنگل
راستے سب نکل گیا جنگل

دشت در دشت دوڑتی بڑکیں
شہر در شہر پھیلتا جنگل

اکتئی صدیوں میں لہلہا یا ہٹا
ایک دن میں اُجڑ گیا جنگل

جب کوئی صاحب جنوں ہی نہیں
راہ پھر کس کی دیکھتا جنگل

سُن رہا ہستامری دُہائی مگر
کیسا گم ستم پڑا رہا جنگل !

دھوپ کے شہر ہی میں لوگ رہے
پاس ہی ہٹا ہرا بھرا جنگل

مجھ کو بھٹکا رہا ہے اے عابد !
اس منزل کی روئیف کا جنگل

سامنے میرے نہ دیکھے گا مجھے!
ہو گا جب تنہا وہ سوچے گا مجھے

مجھ کو میرے رُوبرُو کر دے گی رات
دن مگر مجھ سے چھپا لے گا مجھے!

اتنی لاپرواہی بھی ابھی نہیں
ایسے اک دن تو گنوا دے گا مجھے

دھوپ انگن سے اُترنے کی ہے دیر
پھر وہ روکے گا نہ ٹوکے گا مجھے!

اک خلش عابد رہے گی عمر بھر
سانحہ دل کا نہ بھولے گا مجھے!

جن کے چہرے کچھ کچھ ہو گئے
سوزِ ہجران میں جل رہے ہوں گے

ایسے دیران تو نہیں تھے کھنڈر
چند چڑیلوں کے گھونسلے ہوں گے

جن چراغوں سے اُٹھ رہا ہے دھواں
اُن دھبوں سے وہی لڑے ہوں گے

جستجو میں ہوں جن کی سرگرداں
کیا مجھے وہ بھی ڈھونڈتے ہوں گے

تیری تصویر دیکھنے والے !!
خود بھی تصویر ہو گئے ہوں گے

خواب یا بے خودی کے عالم میں
خود سے ہم بار بار ملے ہوں گے

ایسے گستاخ تو نہ تھے عابد
کچھ نہ یادہ ہی پی گئے ہوں گے

جہاں کہیں بھی گیا وہ مری نظر میں تھا
میں اپنے گھر میں ہی بیٹھے ہوئے سفر میں تھا

نہ ابھرا ذائقہ میرا کسی زباں پہ کبھی
وہ میں ہی تھا جو نہاں شاخ بے ثمر میں تھا

وہ ایک بات جو کھل کر زباں پر آنہ سکی
اُس ایک بات ہی کا ذکر شہر بھر میں تھا

مرے ہی خون سے سینچا گیا تھا نخلستان
مرے لیے ہی نہ سایہ کسی شجر میں تھا

بھٹک رہا تھا عبث در بدر میں اے عابد
مجھے خبر ہی نہ تھی وہ مرے ہی گھر میں تھا

یہ مانا ایک نصف سا دیا ہوں
مگر ظلمات کا دشمن رہا ہوں

کہاں جاؤں گا خود سے بھاگ کر
امیدوں کے حصاروں میں گھرا ہوں

کوئی سمجھے تو کیوں کر مجھ کو سمجھے
کبھی نقطہ کبھی میں دائرا ہوں

بھٹکتا ہے تو اپنی جستجو میں
میں اپنا آپ تجھ میں ڈھونڈتا ہوں

خود اپنے چہرے سے واقف نہیں میں
زمانے کے لئے گواہ بن گیا ہوں

بتا کیا اس سے بڑھ کر اور کرتا
تری خاطر میں خود سے بھی لڑا ہوں

یہ کوئی شہر ہے عاید کہ جنگل
بھرے بازار میں ٹوٹا گیا ہوں

دور تک رہ گزر ہے تابندہ
مگر ہی کا سفر ہے تابندہ

تیرگی میں تمام شہر ہے غرق
اک دریچہ مگر ہے تابندہ

اہل فن ہو گئے ہیں گوشہ نشین
ہنر بے ہند ہے تابندہ

قافلے کا کہیں نشان ہی نہیں
صرف گردِ سفر ہے تابندہ

بمقام جب سے گری ہے اے عابد
ایک میرا ہی گھر ہے تابندہ

دشتِ تنہائی کا آسیب ڈراتا ہے مجھے !
اس خرابے میں کہاں چھوڑ کے جاتا ہے مجھے !

صورتِ موم ہے اے دوست ابھی میرا وجود
میں پگھل جاؤں گا کیوں آتج دکھاتا ہے مجھے

رات آتی ہے تو کرتی ہے مری دل جوئی
دن جب آتا ہے تو دن بھر ہی رلاتا ہے مجھے

ثبت صدیوں سے ہیں جس پر مرے قدموں کے نقوش
رہ نما آج وہی راہ دکھاتا ہے مجھے

کل جسے میں نے دکھائی تھی رہ مے خانہ
آج وہ پینے کے اُدا ب سکھاتا ہے مجھے

وہ عجب ڈھنگ سے کرتا ہے پریشیاں مجھ کو
اک نیا روپ مرا روز دکھاتا ہے مجھے

ایک چہرہ بھی شناسا نہ ملا اے عابد
یہ بھرا شہر بھی صحرا نظر آتا ہے مجھے

صحرائے خامشی کا نہ مجھ کو سراب دے
میرے سوال کا مجھے کچھ تو جواب دے

کب سے اسیر گردشِ لیل و نہار ہوں
جو میرے بس میں ہو مجھے وہ آفتاب دے

ہر سو تو مہمات کی چھائی ہوئی ہے گرد
اہلِ زمیں کو پھر کوئی تازہ کتاب دے

سُورج، ستارے چاند دیے آسمان کو
مجھ دشت کو بھی تو کوئی خود رکھلا دے

ظلمت میں کام آئیں گے عابدِ یسٰی چراغ
آنکھوں میں تو سجاکوئی جتنے بھی خواب دے

گزرتے بادلوں سے انتخابیں کر رہا تھا
کھلی چھت پر وہ بارش میں نہانا چاہتا تھا

اُسے جو کچھ بھی کہنا تھا وہ مجھ سے کہہ چکا تھا
مگر میں ان کہی باتوں ہی میں کھویا ہوا تھا

نظر اُسودگی مجھ کو میسر ہی کہاں تھی
مرے حصے میں وہ دھندلے مناظر لکھ گیا تھا

پھر اس کے بعد صبح کا سفر ویشیش تھا جب
شجر کے سائے میں پل بھر میں آخر کیوں رکا تھا

کفن باندھے ہوئے سر سے بھی میدان میں تھے
کوچ کنڈل پہن کر گھر میں وہ بیٹھا ہوا تھا

حرارت بخشا کیا میرے تخیل بستر بدن کو
مرے آگن تک آتے آتے سورج بچ گیا تھا

کبھی ریتیلے پتھر کی طرح دانستہ عابد!
کسی اونی پھاڑی سے لڑھک کر دیکھتا تھا

میں اپنے سینے میں خنجر اُتار کر دیکھوں
وہ سن ہی لے مجھے شاید پکار کر دیکھوں

گروں میں برف کی مانند چلتے سورج پر
زمین کا کرب وہاں بھی اُتار کر دیکھوں

کسی طرح تو مری رُوح کی گھٹن کم ہو
بہاں جسم ہی اپنا اُتار کر دیکھوں

کتا میں ریڈیو اخبار گھر کے نہکامے
کسی اپنے ساتھ میں کچھ پل گوار کر دیکھوں

وہ آسماں پہ ہے نہ کہیں بحرِ دہریں ہے
پھر بھی اک آرزو لیے کوئی سفر میں ہے

پیشِ نگاہ گرد ہے ناممکنات کی
اک اُس ہے کہ پھر بھی دلِ معتبر میں ہے

برسوں ہوئے ادھر سے وہ گزرے تھے ایک بار
ہل چل سی ایک آج بھی دل کے بحر میں ہے

جس کے بیان کے لیے اک عُمر چاہیے
وہ داستان اُس نگہِ مختصر میں ہے

پُر لطف زندگی ہے تو دنیا ہے پرکشش
جب سے کسی کا حُسن مجسمِ نظر میں ہے

عابد رہِ خلوص یہ ہوں پھر بھی گامزن
ایک اک قدم پہ کو خطر اس رہ گزریں ہے

تیرے بارے میں سوچتے رہنا
کتنا دلچسپ ہے غزل کہنا

صحنِ گلشن میں سارا سارا دن
تتلیوں کے ہجوم میں رہنا

شام آئے تو گھر کے آنگن میں
آپ خود سے پہیلیاں کہنا

جھلملاتے ہوئے ستاروں میں
تیرا ہی عکس ڈھونڈتے رہنا

صرف دیکھا ہے چاند نے عابد
میری آنکھوں سے اشکِ غم بہنا

آنے والا نہیں ہے جب کوئی
منتظر کیوں ہے بے سبب کوئی

کیوں عبث اُلجھنوں میں اُلجھا ہوں
جب نہیں خواہش و طلب کوئی

یہ الگ بات ہے کہ یا د نہیں
دل کے کھینے کا تھا سبب کوئی

ہو گئے مجسوں کے عادی لوگ
وانہ ہو گا در پیچہ اب کوئی

ہونہ جائے یہ کائنات اُداس
مُطربہ! نغمہ طرب کوئی

اُئی تھی جب صدائے کُن فیکوؤں
وہ بھی تھا لمحہ عجب کوئی!

کس طرح پھر مناؤں اے عابد
رُوٹھ جائے جو بے سبب کوئی

اپنی ہی بات لگتی ہے خود بھی گراں مجھے
 ہر دن بدلنا پڑتا ہے اپنا بیاں مجھے

تاریکیوں میں ڈوب گیا ہوں میں بے طرح
 یہ کون مل گیا ہے سر کہکشاں مجھے

ناموسِ عشق پر کبھی آنے دیا نہ حرف
 گوروز پیلنا پڑا کوہِ گراں مجھے

میں ہی حصارِ ذات سے باہر نہ آسکا
 ڈھونڈا کیے تھی وسعتِ کون و مکاں مجھے

عابد اڑان کے لیے تو لے جب اپنے پر
 پوچھ لگا ہے پیرِ زمین جسم و جاں مجھے

یہ کیسا آئینہ ہے کیا دکھائی دیتا ہوں
میں اونچے قد کا ہوں کونا دکھائی دیتا ہوں

نہ جانے مجھ سے ہے کتنے ہی پیکروں کا وجود
گر میں خود کوئی سایا دکھائی دیتا ہوں

کر دگے اب نظر انداز کس طرح مجھ کو
زمین پہ عرش پہ ہر جا دکھائی دیتا ہوں

کبھی ہے ساغر زہر اب میرے ہاتھوں میں
کبھی صلیب پہ لٹکا دکھائی دیتا ہوں

نِکل چکا ہوں میں جب سے تمام بحر و بر
ہوا کے دوش پہ اُلٹتا دکھائی دیتا ہوں

جمی ہے گرد بھی آئینوں پر اے عابد!
نہ جانے ان دنوں کیسا دکھائی دیتا ہوں

اپنے ہونے کا تجھے احساس اگر ہو جائے گا
مُعْتَبِرِ نظروں میں تو نا معتبر ہو جائے گا

چند پل میں منتشر ہو جائے گی قوسِ قزح
منظرِ بے رنگ پھر نہ خمِ نظر ہو جائے گا

روک لو گے اپنی آنکھوں میں اگر سیلابِ اشک
دیکھ لینا شہرِ دلِ زبردِ بر ہو جائے گا

بے جہت صحرا ہیں اے عابدانہ ہاتھ لائے گا کچھ
رفتہ رفتہ خود بھی تو گریسِ سفر ہو جائے گا

ایک ایک شے کو شب کا اندھیرا نکل گیا
سُورج تھا ہوشیار کہ بچ کر نکل گیا

پتھر سمجھ رہے تھے سبھی آج تک جے
میں نے چھو اتو موم کی صورت پھیل گیا

ہر لحظہ تشنگی مری بڑھتی چلی گئی!
میں قطرہ قطرہ کر کے سمندر نکل گیا

پینچی تھے زیرِ آب تو پیڑوں پھیلیاں
یہ منظرِ عجب مری آنکھوں کو چھل گیا

اہلِ نظر نے مجھ کو کہا "آذرِ سخن"!!
پیکرِ کسی کا جب مرے شعروں میں ڈھل گیا

عابد اسے کہا تھا کہ صحرا پہ کہہ کر م!
دیا اُمڈ کے شہر ہی سا نکل گیا

ملا ہٹوں پہلے پہل پھر بھی ایسا لگتا ہے
جہنم جہنم سے وہ جیسے مراشنا سا ہے

رجی ہوئی ہیں ہواؤں میں کیسی خوشبوئیں
یقیناً آج پلٹ کر وہ آنے والا ہے

اک ایک پیٹ پہ چپیاں ہیں گھونٹی آنکھیں
اک ایک دستِ طلب میں شکستہ کا سا ہے

ہے انگ انگ میں اُس کے عجیب سی تھرکن
سنبھالنے پہ بھی وہ جسم کب سنبھلتا ہے

یہ سچ ہے میں بھی اذیت پسند ہو جاؤں
اُسے بھی مجھ کو ستانے میں لطف آتا ہے

جانے کیسی فضا تھی باہر کی!
گھر کے اندر بلا کی آندھی تھی

اک تو صحرا کا بھٹا طویل سفر
دھوپ بھی آج بھتر کی برسی

کیسا پتھر اگیا ہے ہر چہرہ
کتنے حساس ہو گئے ہیں سبھی

آسماں آسماں اُگے سورج
میرے آنکھن میں تیسرگی ہی رہی

کئی صدیوں سے بھٹا جو میل تپاں
منجھ آج ہو گیا وہ بھی !!

تیرے چہرے کا عکس ہوتا ہے
چاند میں روشنی نہیں ہوتی

ہر تمنا جھلس گئی عابد
سویرِ دل تھا کہ آگ جنگل کی

آپ خود اپنے لیے ایک اجنبی سا ہو گیا
 تجھ سے مل کر میں بھری دُنیا میں تنہا ہو گیا

رات بھر ایسی مسلسل ریت کی بارش ہوئی
 صبح تک سارے کا سارا شہر صحرا ہو گیا

شومی قسمت نے میری لُٹ نہ ہی رکھا مجھے
 میں نے دریا کو چھو اتو وہ بھی قُطر ہو گیا

کس قدر پُرسوزہ تھی وہ ایک آہ کر بناک
 دو پہر کی دُھوپ کا بھی رنگ کالا ہو گیا

دوستوں سے وہ ملاقاتیں وہ باتیں اب کہاں
 خود کو بھی دیکھئے ہوئے غائب نہ مانا ہو گیا

خود سے بھی بے نیاز ہو جائیں
اُو اک دوسرے میں کھو جائیں

کیوں نہ ہم کشتِ نا اُمیدی میں
اُرزوں کے بیج بو جائیں !!

کب تک اختر شماریاں آخر
ڈھل چلی رات اب تو سو جائیں

تیری یادوں کے شبِ بنی جھونکے
اکثر آنکھیں مری بھگو جائیں

دن کی بے کیفیاں سُلا دیں ہم
شب کی سرمستیوں میں کھو جائیں

کہیں گردِ آبِ شرم سار نہ ہو
نا وصال پہ ہی ڈبو جائیں

عابد اُن کو تلاش کرتے ہوئے
ہم بھی اِس بھڑ میں نہ کھو جائیں

قدم قدم پر طلسمی اُٹھو لہجہ رہا تھا
کسی کو ہرنے کا جال پھیلا یا جا رہا تھا

عجیب سی شکش میں دونوں ہی مبتلا تھے
کسی کو میں تو مجھے کوئی آزمایا رہا تھا

سبھی کو معلوم تھا یہی فتح پر ہے شاداں
وہ تہقہوں میں شکست اپنی چھپا رہا تھا

کسی سے ملنے کی مجھ کو فرصت ہی کب ملی تھی
وہاں میں خود اپنے آپ کو ڈھونڈتا رہا تھا

اگرچہ اندھی ہواؤں کا تھوڑا دور عابد
چراغ سے میں چراغ پھر بھی جلا رہا تھا

میں بے خبر تھا آج تک اپنے وجود سے
پھر ایک بار غیب سے آواز دے مجھے

پیاسی زمیں کی اور بھی کچھ پیاس بڑھ گئی
برسے بغیر آج بھی بادل گزر گئے !

ہر روز پڑھتے ہو مرے چہرے کے خُصال
اک روز کاش ! تم مرے دل میں بھی جھانکتے

جب ذکر چھڑ گیا مرے حالِ تباہ کا
کچھ دوست جان بوجھ کر انجان بن گئے

معنی کی جستجو میں ہے عاجز اک ایک لفظ
آداب جب سے بدلے ہیں گفت و شنید کے

دیکھا تو کیجئے کبھی دروازہ کھول کر !
دستک یہ کون دیتا ہے روزانہ شب گئے

عابد گئے ہیں جس قدر اُن کے قریب ہم
بڑھتے گئے ہیں اور بھی آپس میں فاصلے

ہے وہ پیش کہ قہرِ خدا ہے زمین پر
سورج پگھل کے پھیل گیا ہے زمین پر

کس راستے سے بھاگ کر آخری جلے گا
انساں سمندروں میں گھرا ہے زمین پر

تھے اک خدا کے سامنے جنت میں بھڑکے
اب تو اک ایک شخص خدا ہے زمین پر

عنقا ہوائے ہر دم محبت ہے آج کل
چاروں طرف خلا ہی خلا ہے زمین پر

عابد ہوا ہے اور بھی تنہا ہر آدمی
جتنا بھوم بڑھتا گیا ہے زمین پر

دُور سے دیکھنے والو مجھ کو !
کبھی پاس اپنے بلا لو مجھ کو !

کوئی جھونکا نہ اُڑا لے جائے
یوں ہوا میں نہ اُچھا لو مجھ کو

پھر نہ بھٹکیں گی مہتاری نظریں
اپنی آنکھوں میں بسا لو مجھ کو

میں ہوں گوندھی ہوئی کیلی مٹی
جو بھی جی چاہے بسا لو مجھ کو

گردشِ وقت مری تاک میں ہے
مے کدے سے نہ نکالو مجھ کو !

شاخ سے توڑ ہی ڈالا ہے اگر
اپنے بالوں میں سجا لو مجھ کو !

پی چکا ہوں میں بہت لے عابد
گرے والا ہوں سنبھالو مجھ کو

گناہ دے گناہی ایک سے ہیں
عجب مُنصف انوکھے فیصلے ہیں

فقروں کو نہ جانے کیا ہوا ہے
بیاباں میں صدائیں دے رہے ہیں

یہ کس نے لکھ دیا پایا بیاں پر
تسمندر اور گہرے ہو گئے ہیں

ترا ذکر آگیا ہے اَلْفَاکًا
ہمیں شکوے سب اپنے آپکے ہیں

یقین اُس پر بھی اب آتا نہیں ہے
جو اپنی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں

کبھی سرسوں جہاں پھوٹی ہوئی تھی
انہیں کھیتوں میں اب تھوہرا گئے ہیں

سبھی اشجار ہیں بے برگ عابد
پرندے بے طرح سہمے ہوئے ہیں

رُودادِ قیسِ ہو کہ مری داستانِ عشق
دُنیا کے لب پہ کوئی تو افسانہ چاہیے

۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک

دل کا قصہ کبھی دنیا کا فسانہ لکھوں
آخر ان ٹوٹے ہوئے حرفوں سے کیا کیا لکھوں

بھیلکی آنکھوں میں پھرتی نہیں تحریر کوئی
اپنے ہونٹوں پر ہی اب حرفِ تمنا لکھوں

میں سمندر ہوں مگر خود کو جو لکھنا پڑ جائے
دھوپ میں ایک جھلستا ہوا صحرا نکھوں

لکھنے بیٹھا تھا تو کیا کچھ نہ تھا لکھنے کے لئے
اور اب سوچ رہا ہوں کہ تجھے کیا لکھوں

مرے دکھ سکھ سے نہیں کوئی بھی واقف عابد
اس بھرے گھر میں نہ کیوں خود کو اکیلا لکھوں

دل میں بے چینی نہ تھی سر میں کوئی سودا نہ تھا
یہ ہے قصہ اُن دنوں کا جب تجھے دیکھا نہ تھا

ایک پل میں تم بھلا دو گئے کئی برسوں کا پیار
یوں بھی ہو سکتا ہے یہ میں نے کبھی سوچا نہ تھا

آئینے میں خود کو جب دیکھا تو حیرانی ہوئی
آج پہلے کی طرح ہنستا ہوا چہرہ نہ تھا

بے تکلف جس کو کہہ سکتا میں اپنا غم گسار
کوئی میرے حلقہ احباب میں ایسا نہ تھا

زندگانی سے بہ صد اخلاص پیش آتے رہے
ہم سے گو اس بے مروت کا سلوک اچھا نہ تھا

آج تو نے مجھ سے کر ڈلے ہیں کتنے ہی سوال
تیرے میرے درمیاں تو ایک بھی پر دانہ تھا

آرزوؤں کے وہ ہنگامے وہ لطف انتظار
اُن دنوں کا ذکر ہے جب شہرِ دل اُجڑا نہ تھا

چوڑے کچھ دل پر لگی ہے آج اے عابد! اضر
در نہ یوں محزوں تجھے پہلے کبھی دیکھا نہ

پیغام کس کے آنے کا پُر وایتیوں میں تھا!
اک انتظار صبح کی انگڑائیوں میں تھا

وہ سطح آب پر ہی مجھے ڈھونڈتے رہے
میں بحر بے حدود کی گہرائیوں میں تھا

بے اعتنائیوں کے وہ کیسے تھے سلسلے
میں آپ خود بھی اپنے تماشا یوں میں تھا

صرصر کا نام لکھا تھا ہر شاخ و برگ پر
مصرف پھر بھی میں چمن آرائیوں میں تھا

تخ بستہ ہاتھ اُس کا چھو تو کھلا یہ راز
بے گانہ پن کیوں اُس کی شناسائیوں میں تھا

مانا کہ سب اُسی کے تمنائیوں میں تھے!
میرے سوا تھا کون جو شیدا یوں میں تھا

باز ارشہر میں بھی ہوں عابد اُداس اُداس!
خوش تھا جب اپنی ذات کی تنہائیوں میں تھا

زندگانی سے بہ صد اخلاص پیش آتے رہے
ہم سے گو اس بے مروت کا سلوک اچھا نہ تھا

آج تو نے مجھ سے کر ڈالے ہیں کتنے ہی سوال
تیرے میرے درمیاں تو ایک بھی پر دانہ تھا

آرزوؤں کے وہ ہنگامے وہ لطف انتظار
اُن دنوں کا ذکر ہے جب شہرِ دل اُجڑا نہ تھا

چوٹ کچھ دل پر لگی ہے آج اے عابد! ضرور
ورنہ یوں محزوں تجھے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

پیغام کس کے آنے کا پُر دایوں میں بھتا!
اک انتظار صبح کی انگڑائیوں میں بھتا

وہ سطح آب پر ہی مجھے ڈھونڈتے رہے
میں بحر بے حدود کی گہرائیوں میں بھتا

بے اعتنائیوں کے وہ کیسے تھے سلسلے
میں آپ خود بھی اپنے تماشا یوں میں بھتا

صرصر کا نام لکھا تھا ہر شاخ و برگ پر
مصرف پھر بھی میں چین آرائیوں میں بھتا

منج بستمہ ہاتھ اُس کا چھو تو کھلا یہ راز
بے گانہ پن کیوں اُس کی شناسائیوں میں بھتا

مانا کہ سب اُسی کے تمنائیوں میں تھے!
میرے سوا تھا کون جو شیدا یوں میں بھتا

بازارِ شہر میں بھی ہوں عابد اُداس اُداس!
خوش تھا جب اپنی ذات کی تنہائیوں میں تھا

اے دل ساری دُنیا جھوٹی، سارے دُنیا والے جھوٹے
بس اک پیار کا بندھن سچا، باقی رشتے ناتے جھوٹے

دوارے دوارے اک لکھ جگاتا، نگرے نگرے پھر اپنے چوکی
بیچ کی بھکشا کہیں نہ پائی، برسوں بوجھ اٹھائے جھوٹے

رات نے چاند کو گود لیا جب اُس بندھی کچھیں بھی لیکن
صبح کا تارا جاتے جاتے، کر گیا سارے سینے جھوٹے

اس جھوٹے سنسار کا بابا، اب تو اک اک کام ہے جھوٹا
بادل بھی برساتے جھوٹے، سورج بھی چمکائے جھوٹے

شہر اور اہل شہر کے چہرے، باہر سے کچھ اندر سے کچھ
دشت بھی دشت نہ رہتا عا بد اس میں جو دکھائے جھوٹے

ہر دوست کو آزمایا رہا ہوں
وانستہ فریب کھایا رہا ہوں

جادہ نہ کوئی نشانِ منزل
بے سمت قدم بڑھایا رہا ہوں

کیا یوں پلٹ آئے گا وہ بچپن
کیوں ریت کے گھر بنایا رہا ہوں

وہ، اور نگاہِ لطف مجھ پر
کس وہم میں مبتلا رہا ہوں

آنکھوں میں نہیں ہے آج بھی نیند
کل رات بھی جاگتا رہا ہوں

منزل کے قریب ہوں میں شاید
ہر گام پہ لڑکھڑا رہا ہوں!

میں ہوں اک ذرہ پھر بھی عابد
سُورج سے نظر ملا رہا ہوں

جوشِ جنون و ہمتِ مردانہ چاہیے
اُس شمعِ رو کو صورتِ پروانہ چاہیے

رودادِ قیس ہو کہ مری داستانِ عشق
دُنیا کے لب پہ کوئی تو افسانہ چاہیے

لائیں گے اہل ہوش و خرد انقلاب کیا
اس کام کے لئے کوئی دیوانہ چاہیے

تنظیمِ مے کدہ پہ شکایت بجا سہی
رندوں میں بھی تو جراتِ رندانہ چاہیے

دل میں خلوص اور محبت ہو موجِ زن
عابد لبوں پہ نعرہٴ مستانہ چاہیے

وہ جو رحمت اٹھائیں آنے کی
جاگے قسمت غریب خانے کی

گلستاں سے دھواں سا اٹھتا ہے
مانگیے خمیر آشیانے کی !

بڑھ گئی اور بے قراری دل
جب خبر آئی اُن کے آنے کی

بات کرتا ہے تو بھی اے ناصح
کس زمانے میں کس زمانے کی

عابد اشعار کہنے سے پہلے
نبض پہچانیے زمانے کی !

یہ حقیقت ہے میں ہوں ذرّہ خاک
میرے تالبع ہیں پھر بھی ہفت افلاک

تشنہ کامی سی تشنہ کامی ہے
زہر بھی ہے مرے لیے تریاک

اہل دل کی فقط یہی پہچان
چہرہ زرد، دیدہ نمناک

خود بھی حیراں ہیں حضرت زرداں
آدمی اور اس قدر بے باک

کیوں میں شہرِ خرد میں لے عابد
لیے پھرتا ہوں دامنِ صد چاک

آرزو دل میں رہی حسرت و حواں کی طرح
زندگی ہم نے گزاری شبِ ہجراں کی طرح

میرے پہلو میں نہیں ہے وہ گلِ تر جب سے
گلستاں بھی نظر آتا ہے بیاباں کی طرح

زندگانی کا توازن نہ بگڑنے پائے
جام گردش میں رہیں گردشِ دوراں کی طرح

آرزوؤں کے وہ ہنگامے کہاں اُن کے بغیر
دل ہے صنسان کسی شہرِ خموشاں کی طرح

جان جاتے ہیں وہ عنوان سے افسانے کو
لوگ کم فہم نہیں نامِ ناداں کی طرح

کتنی پُر نور ہے میری شبِ ہجراں عابد
دل میں ہے یادِ صنم شمعِ فروزاں کی طرح

اتنی سی آرزو لئے صحرا نور دہوں
چھانی ہوئی یہ خاک پھر اک بار چھان لوں

اس شہر بے حساں میں اٹھائے گا کون ننگ
کندھوں پہ سر کا بوجھ میں کب تک لئے پھریں

ہو گی نہ مطمئن کبھی دُنیا نے خود پرست
سقراط کی طرح میں اگر زہر بھی پیوں

اپنی تباہیوں پہ مجھے ہنسنے دیجئے
میں چپ رہا اگر تو یہ ڈر ہے نہ رو پڑوں

عابد ہے خواہشات کی دیوار ہر طرف
لگتا ہے جیسے میں کسی زنداں میں قید ہوں

اتنے چہروں میں نہیں کوئی شنا سا اپنا
اس بھرے شہر میں اک شخص تو ہوتا اپنا

کھو گئے بھول بھلیوں میں ترے کوچے کی
ورنہ کچھ اور ہی تھا آج ارادہ اپنا

ہم تھے بہرِ وپیے دُنیا کا اڑاتے تھے مذاق
لوگ دیکھا کیے خوش ہو کے تماشا اپنا

وہ کیا دور جب اک جام سے پیتے تھے سبھی
اب تو ہر رند کا پیمانہ ہے اپنا اپنا

اتنی دُشوار نہ تھی منزل مقصود مگر
ہم نے دانتہ بدل ڈالا ہے رستا اپنا

لوگ کرتے رہے نظارہ لبِ دریا سے
ڈمگتا رہا موجوں میں سفینا اپنا

دل کے آئینے میں جب غور سے دیکھا عابد
اجنبی سا نظر آیا ہمیں چہرا اپنا

سرِ مایہ جاں اُن پہ لٹا کیوں نہیں دیتے
یہ قمرِ صُحبت بھی چُکا کیوں نہیں دیتے

یوں بادِ گساروں کو تندِ بَدب میں نہ ڈالو
مے خانے میں مے ہے تو پلا کیوں نہیں دیتے

خود بے خبرِ منزلِ مقصود ہیں ورنہ
منزل کا پتہ راہ کس کیوں نہیں دیتے

جب جس وفا کا کوئی گاہک نہیں ملتا
پھر تم بھی دُکان اپنی بڑھا کیوں نہیں دیتے

کیوں سامنے اُن کے ہو لیس و پیش میں عابد
حالِ دل بے تاب سنا کیوں نہیں دیتے

پڑھ ہی سکا کوئی نہ سمجھ ہی سکا مجھے
 کس ساعتِ عجیب میں لکھا گیا مجھے

پھر دیکھ پھیلتا ہوں میں دنیا میں کس طرح
 میرے حصار سے کبھی باہر تو لا مجھے

یوں بھی ہوا ہے بے خودیِ عشق میں کبھی
 خود اپنے آپ پر ترا دھوکہ ہوا مجھے

تدبیر کر رہا ہوں میں کب سے بہ صد خلوص
 اعجاز کوئی اے مری قسمت! دکھا مجھے

مجھ کو اُمید تھی کوئی عقدہ کرے گا وا
 میری ہی داستاں وہ سناتا رہا مجھے

اُن کے بغیر گلشنِ کشمیر بھی ہے دشت
 عابدِ جلا رہی ہے یہ ٹھنڈی ہوا مجھے

پھر وہی ہے سونے گھر کی کالی دیواروں کا ساتھ
آنکھ کھلنے تک رہا کیا کیا حسیں خوابوں کا ساتھ

پیا سے کا پیا سا ہی رکھا میری غیرت نے مجھے
ورنہ مجھ کو ہوتا میسر کتنے دریاؤں کا ساتھ

کون اک مظلوم پر دسی پہ کھائے گاترس
لوگ دیں گے اپنے ہی گاؤں کے باشندوں کا ساتھ

گرتے پڑتے پاہی لوں گا اپنی منزل ایک دن
چھوڑ دوں عابد اگر میں قافلے والوں کا ساتھ

کتنے پانی میں ہوں آخر آزمانا ہے مجھے !
ایک دن خود کو بھی آئینہ دکھانا ہے مجھے !

دل غموں سے کر لے سمجھوتا میں اس کوشش میں ہوں
ایک بستا گھر اُجڑنے سے بچانا ہے مجھے

فرق بس یہ ہے مرے سر پر نہیں کانٹوں کا تاج
آج ورنہ خود صلیب اپنی اٹھانا ہے مجھے !

ذکرِ فریاد اس میں ہے مہمید کی خاطر فقط
درحقیقت اپنا افسانہ سنانا ہے مجھے

کچھ تو اپنے زندہ دل ہونے کا رکھنا ہے بھرم
چلے دل روتا ہو پھر بھی مسکرا نا ہے مجھے

اس طرح ترتیب دینا ہے مجھے ہر واقعہ
آپ بیتی کو بھی جگ بیتی بنانا ہے مجھے !

یادِ عشرت نہیں عابد تو اشکِ غم سہی
نیشنگی اپنی بہ ہر صورت بچھانا ہے مجھے

حُسنِ لقیں سے کام لے، وعدے پر اعتبار کر
اُتے نہ آئے وہ یہاں، تو مکرِ انتظار کر

مانا کہ شش جہت یہ ہے، میرا وجود مُکشف
لطف تو جب ہے مجھ پہ بھی، تو مجھے اُشکار کر

رسمِ جنون بھی ہے یہی، شانِ جنوں بھی ہے یہی
دامنِ تار تار کو، اور بھی تار تار کر!

تُو نے عیشِ عذاب میں اُنکھوں کو مبتلا کیا
کس نے کہا تھا یہ تجھے، رنگوں پہ اعتبار کر

حالِ دل پیرِ اضطراب، پوچھ کر اس سے بار بار
عابدِ سوگوار کو، اور سنہ سوگوار کر

باطن کی آنکھ سے جو کبھی دیکھتا ہوں میں
لگتا ہے جیسے خود سے بھی نا آشنا ہوں میں

اس در سے خالی ہاتھ ہی پلٹا ہے ہر کوئی
دستِ سوال لے کے کہاں آ گیا ہوں میں

مجھ کو ہوا اڑا کے جدھر چاہے لے چلے
پشتا ہوں اور شاخ سے لٹوٹا ہوا ہوں میں

مجھ سا بھی سادہ لوح زمانے میں ہے کوئی
اپنی تباہیوں پہ بھی خوش ہو رہا ہوں میں

ہے ٹھیک یا غلط مرا اندازِ گفتگو
عابد جو کہنا تھا مجھے وہ کہہ گیا ہوں میں

اے دل تو نے پیار کیا ہے کس نرموہی سے
رمتے جو گئی بہتے دریا کس کے میت ہوئے

خود اپنی ہی کستوری کی خوشبو سے بے گل
انجانے میں آہو لیکن ہر جانب بھٹکے

زہریلے ساپوں کا جنگل تاریکی ہر سو
منزل کی دُھن دل میں لیکن اگے کون بڑھے

غیب سے آوازیں دیتا ہے کوئی مجھے لیکن
کیوں کر نکلوں اپنے گھر کی بھول بھلیوں سے

کیسے سوئیں برکھارت میں عابد چین کی نیند
اس موسم میں ہو جاتے ہیں دل کے زخم ہرے

میری وحشت کا یہ قصہ تھا فقط
اک نظر آپ کو دیکھا تھا فقط

کتنی دُوری تھی دلوں میں لیکن
فاصلہ ایک قدم کا تھا فقط

ساری دُنیا تھی نظر سے اُدھل
سامنے تیرا سراپا تھا فقط

ہر گھڑی میرے تعاقب میں جو تھا
میرے ہی دم کا سایا تھا فقط

بہہ گئے کتنے ہی ارمان اس میں
ایک اشک آنکھ سے ٹپکا تھا فقط

تم یہ کیا سوج رہے ہو عابد
اُس نے تو نام ہی پوچھا تھا فقط

ہم نے مانا کہ با ونا بھی نہیں
بے ونا ہے وہ یہ بجا بھی نہیں

کس لئے راستے میں بیٹھے ہیں
کوئی ہم سے یہ پوچھتا بھی نہیں

کون اب رہ بٹائے منزل ہو
دور تک کوئی نقشِ پا بھی نہیں

کب سے ہم دے رہے ہیں آوازیں
کوئی کھڑکی سے جھانکتا بھی نہیں

کیوں ہیں عابد ہم اس قدر مایوس
زندگی اتنی کج ادا بھی نہیں

یہ ہنستے ہیں چاہے دل ان کا جلے
ترے دل جلے ہیں عجب منجلے

وہ سورج صفت بھی نہیں جانتا
کٹے دن ہمارے برے یا بھلے

کھینچے آتے ہیں جانبِ مے کدہ
یہ نہ جانتا ہے کیا ہمیں دن ڈھلے

کسی کا سہارا نہ جب مل سکا
ہم اُنکلی ہوا کی پکڑ کر چلے

محبت میں عابد نہ پاؤ گے کچھ
نہیں سایہ تک اس شجر کے تلے

وہ نظر مہرباں سی لگتی ہے
ہر تمنا جو اس سی لگتی ہے

یہ سرِ شام کس کا قتل ہوا
کیوں شفق خوں چکاں سی لگتی ہے

ہاں ذرا پھر حدیثِ قیس کہو
یہ مری داستاں سی لگتی ہے

زندگانی بھی آج تیری طرح
ہم سے کچھ بدگماں سی لگتی ہے

جب سے وہ میرے ساتھ ہیں عابد
رہ گزار کہکشاں سی لگتی ہے

سُرخ، نیلی، سبز، پیلی اور دھانی تیلیاں
ظاہرِ انخوش رنگ لیکن دل کی کالی تیلیاں

یہ کسی کو بھی نہیں معلوم دھوکے میں ہے کون
کاغذی ہی پھول ہیں سب کاغذی ہی تیلیاں

کم نہیں گل کی ہوس پشیمردگی کے بعد بھی
دیکھتا رہتا ہے دن بھر اڑتی پھرتی تیلیاں

اُن کے رنگوں کو نہ دیکھان کی اداؤں پر نہ جا
یہ تو میں ہر پھول پر منڈلانے والی تیلیاں

اب کے سرسوں کی جگہ اُگ آئی ہے تھوہر کی فصل
درنہ اے عابدہ! یہاں حقّیں تیلیاں ہی تیلیاں

غنیمِ اُلفت، غمِ زمانہ ملا
ہمیں اس زندگی میں کیا نہ ملا

مل گیا آستانِ پیرِ مغان
بے ٹھکانوں کو بھی ٹھکانہ ملا

ہر گھڑی بجلیوں کا ڈر ہے یہاں
کس گلستاں میں اشیانہ ملا

دیر میں کعبہ میں کلیسا میں
لاکھ ڈھونڈا مگر خدا نہ ملا

کیوں نہ ہو درِ خورِ نزعِ عابد
اس کا ہر طور باغیانہ ملا!

میں اپنے درد کا اظہار کر گیا آخر
چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا آخر

اکیلا چھوڑ کے مجھ کو چلا گیا ہے کہیں
اندھیری رات سے سورج بھی ڈر گیا آخر

ہوا کے رخ پہ سنبھل کر چلے بہت پھر بھی
ہمارے سر سے سمندر گزر گیا آخر

خود اپنے سر پہ ہی ہاتھ اپنا رکھ دیا اُس نے
سبھی کو مارنے والا بھی مر گیا آخر

کئی برس جو رہا ہے مرے تعاقب
ایرانک آج وہ عابد کدھر گیا آخر

صورتِ قلب بے تمنا ہوں
آج کل کس قدر میں تنہا ہوں

ایسے کرتا ہوں اُن کی دل جوئی
آپ اپنی ہنسی اڑاتا ہوں

پوچھتے ہو مرا ٹھکانہ کیا
رمتا جو گی ہوں بہتا دیریا ہوں

جس کے دل میں ہو پیارا درِ خلوص
اُس بشر کو خدا سمجھتا ہوں

اپنی بربادیوں پہ اے عابد!
آپ ہی تہمت لگاتا ہوں

خانہ دل میں ترے غم کو بسایا جائے
کچھ تو تنہائی کا احساس مٹایا جائے

دل خود دار اجازت نہیں دیتا ہم کو
کہ اُنھیں حالِ دلِ زار سنایا جائے

روشنی کم نہ کسی طور ہولے دیوانو!
دل جلایا ہے تو اب گھر بھی جلایا جائے

مے کدے کے بھی آداب ہیں لے بادہ کشو
مُحتَسِب کو بھی سر اُنکھوں پہ بٹھایا جائے

جو یہ کہتے ہیں نہیں صنفِ غزل میں دوسرے
اُن کو عائد کا کلام آج سنایا جائے

اپنے کندھوں پہ رکھ کر اپنی صلیب
 آزمانے چلا ہوں آج نصیب

حق پرستوں کو سنگسار کرو
 یہی شہسود خرد کی ہے تہذیب

نہ بتا میری خامیاں مجھ کو
 میرے اندر چھپا ہے میرا قیب

چاند پر تم پہنچ گئے ہو مگر !
 دلِ انساں تو ہے بہت ہی قریب

وہ نہ سمجھیں گے اس کو اے عابد
 تیرا افسانہ ہے عجیب و غریب

یوں بھی شبِ فرقت کبھی محسوس ہوا ہے
جیسے کوئی پہلو سے ابھی اٹھ کے گیا ہے

ہم نے تو کئی بار تجھے لکھے ہیں خط بھی
ہم نے تو کئی بار تجھے یاد کیا ہے

برسوں ہوئے کشتی کوئی واپس نہیں آئی
اک شخص مگر آج بھی ساحل پہ کھڑا ہے

اب کوئی خریدار نہیں جس دفا کا
ہر تنا جبرِ اخلاص خسارے میں رہا ہے

باتوں سے بھی بنتے ہیں کئی کام جہاں میں
یہ درس ہمیں حضرتِ ناصح سے ملا ہے

آئے غمِ دوراں! تجھے سینے سے لگالیں
صدِ شکر کسی نے تو ہمیں یاد کیا ہے

محسوس ہوا بعدِ ملاقات یہ عابد
درشن کے وہ چھوٹے ہیں مگر نام بڑا ہے

اُس کی جفاؤں میں بھی مروت دکھائی دے
نفرت بھی وہ کرے تو محبت دکھائی دے

دیکھے جو تو کبھی مری آنکھوں میں جھانک کر
ان میں تجھے فقط تری صورت دکھائی دے

گھر سے نکل کے شہر میں تو جستجو تو کر!
ممکن ہے کوئی صاحبِ غیرت دکھائی دے

عابد ہمارے واسطے ہو گا وہ روزِ عید!
جس روز بھی وہ چاند سی صورت دکھائی دے

تسخیر آسماں کے لئے دُور تک گیا
پلٹا میں جب وہاں سے خلا میں الٹ گیا

پھر لوں ہوا کہ دھند میں ہر راہ کھو گئی
اندھا سفر تھا قافلہ رستہ بھٹک گیا

سر سبز ہو سکا نہ مرا باغ آرزو!
پھر بھی کسی کی یاد کا غنچہ چٹک گیا

کچھ اور بڑھ گئی ہے سُن در کی تشنگی
پیما نہ آسمان کا جب بھی چھلک گیا

جب میرا اور اُس کا تعلق ہی کچھ نہیں
عابد وہ سُن کے نام مرا کیوں ٹھٹک گیا

دل کی نگری میں وہ پل بھر سنسنے ہنسانے آیا تھا
جیسے گول میں اک پھلیا اس رچانے آیا تھا

بھنورا کتنا نرموہی تھا سوتج رہا ہے پھول یاب
رُوپ کا لو بھی رس کا رسیا پیاس بجھانے آیا تھا

سُورج چاند ستارے سب ہی بن گئے اُس کے دشمن جا
اک ننھا سا جگنو مجھ کو راہ دکھانے آیا تھا

کیا جانے وہ سوتج کے کیا کچھ چلا گیا بن برسے ہی
بادل بن کر جو صحرائیں پھول کھلانے آیا تھا

میرے من کے دوار پہ کس نے دشنکی تھی لے عابد
سوئی ہوئی ا بھیلا شاؤں کو کون جگانے آیا تھا

انجیامِ وفا سے آشنا ہوں
اور اُن سے وفا بھی کر رہا ہوں

چہرے چہرے کو پڑھ چکا ہوں
پھر بھی انجان ہی رہا ہوں

سننے والے تو تھے گراں گوش
بے مصرف بولتا رہا ہوں

تری رحمت کے آسرے پر!
مائل بہ گناہ ہو گیا ہوں

سب لطف بہار اٹھا رہے ہیں
اک میں ہوں کہ خار چن رہا ہوں

رودادِ شبِ فراق عساید
تیرے چہرے سے پڑھ رہا ہوں

غمہائے زندگی سے تعارف کرا دیا
تو نے مرا مجھ سے تعارف کرا دیا

سہم نے بڑے خلوص سے گھرا اپنا بیٹونکے
ظلمت کا روشنی سے تعارف کرا دیا

ناصح کی گفتگو سے پریشان ہوں بہت
میرا کس آدمی سے تعارف کرا دیا

گوہم رہیں گردشِ دوراں رہے مگر
انساں کا زندگی سے تعارف کرا دیا

معاہدہ کچھ اور اہل سیاست نہ کر سکے
گلچین کا ہر کلی سے تعارف کرا دیا

رُخ کے روشن ہیں دل کے کالے ہیں
یہ جیس میرے دیکھے بھالے ہیں

آپ ہی نے نظر چرائی ہے
آپ ہی دل چرانے والے ہیں

بے دست دوستوں پہ مرتا ہوں
آستینوں میں سانپ پالے ہیں

مے کشوا و جہ انتشار ہے کیا؟
تم نے کیوں جام توڑ ڈالے ہیں

گیسوؤں سے ہے تان بنا کی رُخ
ان اندھیروں میں کیا اُجالے ہیں

آپ ناراض تو نہیں ہوں گے
ہم بھی اک بات کہنے والے ہیں

آج عابد تری خموشی نے
دل کے سب راز کھول ڈالے ہیں

یہ حقیقت ہے غم و آلام کے ماروں میں ہیں
پھر بھی ہم اے زندگی تیرے طرف اڑیں ہیں

یوں تو کتنے چلتے پھرتے لوگ بازاروں میں ہیں
دل مگر سب کے مقید گھر کی دیواروں میں ہیں

کاؤں، قصبے، شہر ہی تو ہیں نشان ارتقا
ورنہ ذہنی طور پر ہم آج بھی غاروں میں ہیں

ہر بدن جھلسا دیا ہے چلچلاتی دھوپ نے
پھر بھی ہم دیوانے سورج کے پرستاروں میں ہیں

دیکھتے ہیں سب مگر عابد کوئی پڑھتا نہیں ✓
اشتہاروں کی طرح ہم لاکھ نجاؤں میں ہیں

رُوبہ رُوب سے ہے وہ جانِ غزل
دل میں ہے کچھ عجیب سی ہل چل

اُبر آلود سی تھی شام کوئی !
اُن سے جب ہم ملے تھے پہلے پہل

یوں مرے دل میں ہے کسی کی یاد
جھیل میں تیرتا ہو جیسے کنول

گرنہ جائے حیات کا معیار
کیجئے کچھ تو اس میں رد و بدل

بے کسی، رنج، درد، مایوسی
عشق ہے آنسوؤں کا تاج محل

اُف! شب بھر انتظار ترا
کم نہیں سو برس سے اک اک پہل

دیکھ دُنیا کا طور اے عابد
تُو بھی اب وقت کے مطابق چل

کر گیا ظلمتِ ہجراں میں اُجالا چہرہ
مطلع نور ہے اُس جانِ غزل کا چہرہ

✓ خاکہ قلب میں ہو رنگِ تمنا جیسے
یوں مری آنکھوں میں رہتا ہے کسی کا چہرہ

میرے دل میں بھی ذرا جھانک کر زخم بھی دیکھ
تو فقط دیکھ رہا ہے مرا ہستا چہرہ

بیٹھا رہتا ہوں میں رستے میں یہ امید لئے
کوئی شاید نظر آجائے شناسا چہرہ

پارہا ہوں میں کئی روز سے تنہا خود کو
پڑھ رہا ہوں میں کئی روز سے چہرا چہرہ

بن گیا خار مرے کوٹ کے کالر کا گلاب
کر گیا تازہ اک اک زخم کسی کا چہرہ

لاکھ حالِ دل بے تاب چھپا اے عابد
کہہ ہی دے گاشبِ ہجراں کا فسانا چہرہ

